قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ——— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون: ۸۷۹۲۴۶

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون: ثریا عندلیب

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ناشر: عطاء الرحمٰن آرائیں

طابع: خالد منصور نسیم

مطبع: النور پرنٹرز و پبلشرز

۳/۲ فیصل نگر، ملتان روڈ، لاہور ۲۵

ٹیلیفون ——— ۴۸۵۸۲۶

مقامِ اشاعت: ۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

جلد ۴۵ ——— جون ۱۹۹۲ء ——— شمارہ ۶

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک ——— ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ: ۱۰/- روپے

فہرست مضامین

لمعات	ادارہ	۲
ربو	بشیر احمد عابد	۷
قرآن کا معاشی نظام	علی محمد چدھڑ	۱۶
چراغ تلے اندھیرا	محمد اسلم رانا	۲۳
قرآن کا معاشی نظام	ثریا عندلیب	۲۷
اِک ولولۂ تازہ	شاہد خورشید	۳۰
باب المراسلات		۳۴
نُسخہ اور اس کا استعمال	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۴۲
مذہبی پیشوائیت اور قرآن	اعزاز الدین احمد خاں	۵۰
حقائق و عبر	ادارہ	۶۳
ایک سوال	راستی	۶۵
بچوں کے صفحات	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۶۶
نصابِ زکوٰۃ میں تبدیلیاں	ادارہ	۶۹
اشتہار کتب	ٹرسٹ	۷۶
اعلاناتِ درسِ قرآن	ادارہ	۷۸

لمعات

۱۔ قربانی

آج سے قریباً چار ہزار سال قبل، سرزمین عراق میں ایک جابر اور سرکش قوم حکمران تھی۔ حکومت اور دولت کے نشہ نے انہیں خدا سے بھلا رکھا تھا۔ بادشاہِ وقت کی پرستش ہوتی تھی۔ چاند، سورج، ستارے، حتیٰ کہ مٹی اور پتھر کے بُت پوجے جاتے تھے۔ لیکن اللہ کی قدرت دیکھئے کہ اُس نے اِس ظلمت اور جہالت کے مرکز سے ایک ایسے عظیم الشان خداشناس کو اٹھایا جو دنیا کے لئے پیامِ توحید کا مرکز بن گیا۔ اس برگزیدہ ہستی کا نام تھا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ اس سچائی کے علمبردار نے اللہ کے پیغام کی نشر و اشاعت میں جس قدر تکالیف اٹھائیں ان کے ذکر کا یہ موقعہ نہیں۔ اس وقت ہم صرف یہ دیکھیں گے کہ اللہ کا یہ مخلص بندہ۔ اپنے آقائے حقیقی کے ایک ہلکے سے اشارہ پر، برضا و رغبت، کتنی بڑی قربانی کے لئے تیار ہو گیا۔ آپ کی عمر زیادہ ہو چکی تھی اور اولاد کوئی نہ تھی۔ آپ کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت عطا ہوا اور ایک فرزندِ سعید و ارجمند کی بشارت ملی۔ ان منتوں اور دعاؤں کا بچہ اور وہ بھی بڑھاپے کی عمر میں۔ جس قدر بھی پیارا ہو کم ہے۔ بچہ بڑھا، پھولا، پھلا، کام کاج میں باپ کا ہاتھ بٹانے لگا تو خواب میں اشارہ ملا کہ بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کر دیا جائے۔ کہنے کو تو یہ حکم دو لفظوں میں ادا ہو گیا۔ لیکن

دل صاحبِ اولاد سے انصاف طلب ہے!

بال بچوں والے ذرا کلیجہ تھام کر سوچیں تو سہی کہ اس حکم کی تعمیل میں کتنی قیامتیں پوشیدہ تھیں۔ ایسا اللہ آمین کا بچہ برابر کا جوان بیٹا، عصائے پیری، تمام زندگی کی اُمیدوں کا ایک ہی آسرا اور اُسے اپنے ہاتھوں ذبح کر دیا جائے! لیکن پریت کی ریت نیاری ہے۔ دیارِ محبت کے قانون اس دنیا سے جداگانہ ہیں۔ وہاں تو کچھ بھی اپنا نہیں ہوتا۔ حکم کا اشارہ پایا اور لبیک اللّٰھم لبیک!! کہتے ہوئے سر جھکا دیا۔ بیٹے کو ساتھ لے کر نکلے۔ راستہ میں پوچھا۔ اے بیٹا! "اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی"۔ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ کہو تمہارا کیا خیال ہے؟

سوال آپ نے سُن لیا۔ اب اس بچے کا جواب بھی سُن لیجئے۔ " یٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ ○ (۳۷:۱۰۲)" جو آپ کو حکم دیا گیا ہے، بلا تامل کر گذریئے، انشاء اللہ آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔ سبحان اللہ، باپ تو ان ارادوں کا باپ اور بیٹا تو اس حوصلے کا بیٹا۔ باپ نے بیٹے کو زمین پر لٹا دیا، چھری ہاتھ میں۔ باپ نے اپنی محبت کے تمام جذبات اور بیٹے نے اپنی جان اور جوانی کو محبوب حقیقی کے ایک اشارے پر قربان گاہِ عشق میں بلاتکلف بھینٹ کے لئے حاضر کر دیا۔ یہ تسلیم و رضا کی آخری منزل تھی۔ چھری چلنے کو تھی کہ آواز آئی۔

یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ○ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ○ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ○ وَ فَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ ○ وَ تَرَكْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ ○ سَلٰمٌ عَلٰۤى اِبْرٰهِیْمَ ○ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ○ (۳۷/۱۰۴)

"صد مرحبا اے ابراہیم (تو نے تو کمال کر دیا) بے شک تو نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا۔ ہم مخلص بندوں کو اسی طرح اپنی رحمت سے نوازا کرتے ہیں۔ یقیناً یہ امتحان بہت بڑا تھا۔ (جس میں تو پورا اُترا ہے) ہم اس کے بدلے میں تمہیں ایک بہت بڑی قربانی دیتے ہیں جو قیامت تک یادگار رہے گی۔ درود و سلام ہو ابراہیم پر۔ ہم اپنے مخلص بندوں کو ایسا ہی اجر دیا کرتے ہیں۔"

اس عظیم الشان صحرائی قربان گاہ کی مقدس زمین کو اللہ نے "اپنا گھر" بنانے کے لئے منتخب فرمایا اور دنیا کے تمام توحید پرستوں کو حکم دے دیا کہ وہ اسے اپنی نمازوں کا قبلہ، اپنی آرزوؤں کا کعبہ اور اپنی اجتماعی زندگی کا مرکز قرار دیں۔ دنیا کے ہر حصے سے چل کر یہاں پہنچیں اور اس واقعۂ عظیمہ کی یاد میں ہر سال تسلیم و رضا اور اطاعت و ایثار کے پیمان کو تازہ کریں۔ یہ ہے وہ مقام جہاں یہ اجتماع ہوتا ہے اور یہ ہے وہ واقعہ جس کی یاد میں قربانی کے جانور اللہ کے نام پر ذبح کئے جاتے ہیں۔ قربانی کے جانوروں کے متعلق فرمایا کہ

لَكُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ اِلَى الْبَیْتِ الْعَتِیْقِ ○ (۲۲/۳۶)

(ان جانوروں میں ایک وقت مقررہ تک تمہارے لئے (طرح طرح) کے فائدے ہیں۔ پھر اس خانۂ قدیم تک پہنچا کر ان کی قربانی کرنی ہے)۔

اس قربانی کا مقصد یہ ہے کہ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآىِٕسَ الْفَقِیْرَ ○ قربانی کا گوشت خود بھی کھاؤ اور بھوکے محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔ یعنی اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ تم یونہی جانوروں کا خون بہاؤ اور نذر کے طور پر ذبح کر کے انہیں گڑھوں میں دبا دو۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ یہ قربانیاں اللہ کے ان مہمانوں کی جو اس تقریب پر اللہ کے گھر میں جمع ہوئے ہیں، محتاجوں اور مسکینوں کی غذا کا کام دیں۔ پھر ان واضح احکامات کے بعد کھلے کھلے الفاظ میں یہ بھی بتا دیا کہ یاد رکھو! کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ اللہ کو تمہارے ان چڑھاووں کی ضرورت ہے! وہ اس خونریزی سے خوش ہوتا ہے! یا محض اس رسم کی ادائیگی

سے تم اس کے مقرب بن سکتے ہو۔ ہرگز نہیں۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَ لَا دِمَآؤُهَا وَ لٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ
كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (۲۲/۳۷)

"یاد رکھو! اللہ تک ان قربانیوں کا نہ تو گوشت پہنچتا ہے نہ خون۔ اس کے حضور جو کچھ پہنچ سکتا ہے وہ تو صرف تمہارا تقویٰ ہے۔ (یعنی اس کے احکام کی پابندی میں تمہاری خواہشات و جذبات کی قربانی) باقی رہا یہ کہ اس نے ان جانوروں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے (کہ تم ان سے فائدے حاصل کرو اور کام لو) تو یہ اس لئے نہیں کہ تم اپنے آپ کو بڑی قوتوں کا مالک سمجھنے لگ جاؤ اور سرکشی اختیار کر لو۔ بلکہ اس لئے کہ تم اللہ کے نام کی بڑائی کا آوازہ بلند کرو۔ یقیناً اس میں اس کے مخلص بندوں کے لئے (بہترین نتائج کی) خوشخبری ہے۔"

یہ ہے قربانی کی اصل اور یہ ہے اس کی رُوح۔ یہ ہے اس کی غایت اور یہ ہے اس سے مقصود کہ اس رسم کی ادائیگی سے یہ حقیقت آنکھوں کے سامنے آجائے کہ اگر اس کا حکم ہو تو حضرت خلیل اکبرؑ اور جناب ذبیح اللہ علیہما السلام کی طرح اولاد اور اپنی جان جیسی عزیز ترین چیزیں بھی اس کی راہ میں بلا تامل قربان کر دی جائیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ایک مسلمان صحیح معنوں میں عبدِ مسلم بنتا ہے "بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ" (۲:۱۱۲)۔ ہاں! جس نے اپنے تمام ارادوں اور خواہشوں کو اللہ کے حکم کے تابع کر دیا وہی مسلمان ہے۔

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

قربانی ہمیں یہی سکھاتی ہے کہ سچا مسلمان کیسے بنا جاتا ہے۔ آپ سب کو عید مبارک ہو۔

۲۔ قرآن کا معاشی نظام

علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ "انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین حل قرآنِ مجید نے تجویز کیا ہے۔"

(بحوالہ اخبار زمیندار ۲۴، جون ۱۹۲۳ء)

پھر یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو سالِ نو کے اپنے ریڈیائی پیغام میں انہوں نے فرمایا۔ "ہسپانیہ کے باشندے ایک نسل، ایک زبان، ایک قومیت، ایک مذہب کے باوجود محض اقتصادی نظریہ کے اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں" لیکن ہم نے ان امور کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔

اپریل ۱۹۸۰ء حکومتِ پاکستان نے ایک کمیشن مقرر کیا تاکہ وہ اسلامی معاشی اصلاحات کا ایجنڈا تیار کرے۔ اس کمیشن کے

سربراہ پروفیسر سید نواب حیدر نقوی تھے۔ انہوں نے کمیشن کے ارکان کے ساتھ مل کر انگریزی زبان میں ایک رپورٹ تیار کی جس کا نام AN AGENDA FOR ISLAMIC ECONOMIC REFORM تھا۔ (اسے ادارہ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈویلپمنٹ اکنامکس اسلام آباد نے کتابی صورت میں شائع کیا تھا)۔ اس کمیٹی نے قرآن کے معاشی نظام کی آخری منزل کی نشاندہی کر دی ہے۔ جس کے مطابق رپورٹ کا خلاصہ یوں بنتا ہے۔

۱۔ اَلْاَرْضُ لِلّٰہ کا فلسفہ یوں کارفرما ہوگا کہ زمین افراد کو بطور امانت دی جائے گی۔ زمین کی خرید و فروخت اور ملکیت کا سارا نظام بتدریج ختم کیا جائے گا۔ اس کے لئے پانچ سال یا دس سال کا عبوری نظام اس طرح تشکیل دیا جا سکتا ہے کہ اس دوران استحصالی مشنری غریبوں کا استحصال نہ کر سکے۔

۲۔ نظامِ جاگیرداری انگریز کے وقت سے رائج ہے۔ اسے سابقہ بیوروکریٹس سے بیک قلم واپس لے کر محکمہ زراعت کے سپرد کر دیا جائے اور پٹواری کو محکمۂ زراعت کا کلرک تصور کیا جائے۔

۳۔ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد سود اور کرایہ داری ہے۔ ملک سے غربت اور بے روزگاری کو ختم کرنے کے لئے بلاسود قرضہ کا اجراء کیا جائے اور کرایہ داری کے نظام کو بتدریج ختم کر کے ہر دکان دار کو مالک دکان یا مالک مکان بنایا جائے۔

۴۔ ہمارے سامنے سوشلزم کا جنازہ نکلا ہے۔ اس سے سرمایہ داری کا حوصلہ بڑھا ہے جو باعثِ افسوس ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ جس سوشلزم نے انسانی ذات اور علمِ وحی کی نفی کی تھی اس سوشلزم کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنی بنیادی خرابی کی اصلاح کرے۔ انسانی ذات اور علمِ وحی کا اقرار کرے۔ اس کے بغیر سوشلزم یا سرمایہ داری کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

۵۔ سرمایہ دارانہ نظام، سوشلزم اور اسلامی معاشی نظام کا تقابل واضح کرنے کے لئے پورے ملک میں مجالسِ مذاکرہ کا اہتمام کیا جائے۔ اس کے بغیر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

۶۔ عدل و احسان کا تصور سوشلزم اور سرمایہ داری سے بالکل جداگانہ فکر ہے۔ اس کو ضرور اجاگر کیا جائے۔

۷۔ دولت کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ یہ صرف اوپر کے طبقہ میں گردش نہ کرتی رہے بلکہ ہر شخص کی ضرورت پوری ہو۔ بقول علامہ اقبالؒ۔

کس درین جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

۸۔ نعمائے خداوندی نوعِ انسان کی میراث ہے اور خاص کر مردِ مومن کی میراث ہے۔ لہٰذا اس پر کسی طبقہ کو اجارہ داری کی اجازت نہ دی جائے۔

۹۔ اس رپورٹ کا اُردو ترجمہ شائع کر کے عام کیا جائے۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک طرف متبادل معاشی نظام کا پہلو

تشنہ ہے اور دوسری طرف یہ انگریزی رپورٹ اُردو دان طبقہ جانتا تک نہیں ہے۔ اسلام کے متبادل معاشی نظام کا چرچا کرنے والے اس رپورٹ کو اُردو میں شائع کرکے عام کیوں نہیں کرتے۔

۳۔ روٹی کا مسئلہ

روٹی کا مسئلہ انسان کے ساتھ یومِ ازل سے چلا آرہا ہے۔ لیکن ہمارے زمانے میں اس نے خاص اہمیت حاصل کرلی ہے۔ نظامِ سرمایہ داری انسانیت کے لئے ٹپ دق ثابت ہوا اور کمیونزم یا سوشلزم کا نظام سلام نکلا۔ اس مسئلہ کا اطمینان بخش اور انسانیت ساز حل اگر کہیں مل سکتا ہے تو وہ قرآن کریم کے معاشی نظام میں ملے گا۔ یہ نظام کیا ہے؟ کیونکر نافذ ہوگا؟ اسے علامہ غلام احمد پرویزؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب **نظامِ ربوبیت** میں پیش کیا ہے۔ جس نے بڑی مقبولیت حاصل کی ہے۔ یہ کتاب طلوعِ اسلام ٹرسٹ ۲۵۔بی گلبرگ ۲، لاہور کی شائع کردہ ہے۔ اس کی ایک ایک کاپی ٹرسٹ مذکور کی طرف سے جناب میاں محمد نواز شریف صاحب وزیرِ اعظم پاکستان، جناب سرتاج عزیز صاحب وفاقی وزیرِ خزانہ اور جناب آصف احمد علی صاحب وزیرِ مملکت برائے اقتصادی امور کی خدمت میں بھی ارسال کی گئی ہے۔

ربوبیتِ عامہ

کے مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے (قرآن کی رُو سے) ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کی بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان کا محتاج نہ رہے۔ اسے قرآنی نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے۔

باسمہٖ تعالیٰ

بشیر احمد عابد
— کراچی

فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝ (۴/۷۸)
سو کیا حال ہے ان لوگوں کا؟ کہ لگتے نہیں سمجھیں ایک بات

ربٰو

طلوعِ اسلام فروری ۹۲ء کے شمارے میں ربٰو سے متعلق ایک خوبصورت مضمون نظر سے گزرا جسے پڑھ کر محسوس ہوا کہ اب اس مسئلے کو سمجھنے میں دشواری باقی نہیں رہنی چاہیئے۔ ربٰو گذشتہ چودہ سو سال سے ملّتِ اسلامیہ کے لئے ایک سنجیدہ موضوع بنا ہوا ہے۔ لہٰذا، اسے سلجھانے کی ہر کوشش قدر کی نگاہ سے دیکھی جانی چاہیئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی شدّت سے ہوا کہ دشواریاں دُور کرنا تو اس صورت میں مفید ہوتا ہے جب کوئی قوم کسی مسئلے کو سنجیدگی اور خلوصِ نیت سے حل کرنا چاہے۔ ہمارے ہاں دشواری یہ نہیں کہ ربٰو کیا ہے؟ بلکہ دشواری یہ ہے کہ ربٰو کے بعد کیا ہے؟ ربٰو کے بالمقابل جو نظام قرآنِ کریم پیش کرتا ہے ہم اس سے نہ مخلص ہیں نہ سنجیدہ! اس کی اپنی الگ وجوہات ہیں۔ ہمارا ضابطۂ حیات عقائد و رسومات پر مبنی ہے۔ اس طرح کے نظامِ زندگی میں شعور بے بس اور عقل عاجز ہوتی ہے۔ اسلاف پرستی، توہم پرستی اور جذبات پرستی اس مسلکِ زندگی کا شعار ہوتا ہے — اسلاف نے کچھ ایسے کارنامے سرانجام دیئے ہوتے ہیں کہ جن کی صحت کو عقلِ حال INTELLECT OF THE AGE — سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا اندھی تقلید کرنی پڑتی ہے جس کا نتیجہ تنگ نظری اور منافقت ہوتا ہے۔ تحقیق و جستجو سے جو وسعتِ نظر اور بینائی نصیب ہوتی ہے، ایسی قوم اس سے محروم ہوتی ہے۔ قرآن کی لغت میں ایسی قوم کو ملعون کہا جاتا ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ (۵/۱۰۶)
اور جب انہیں علم و حکمت کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو یہ کہتے ہیں، نہیں جناب! ہمارے

لئے وہی کچھ کافی ہے جو ہمارے آبا و اجداد ورثہ میں چھوڑ گئے ہیں"۔

حقائق خواہ کتنے ہی روشن اور واضح کیوں نہ ہوں، یہ ہرگز تسلیم نہیں کریں گے۔ انہیں طرح طرح کے باطلانہ لباسوں میں لپیٹ لیا جائے گا۔ اس اندازِ فکر اور طرزِ بود و باش کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ ہر فرد باوجود باطلانہ روش کے اپنے آپ کو جادۂ مستقیم پر سمجھتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی کسی مسلمان کو یہ سمجھانے کی کوشش کرے کہ رشوت حرام ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ محض وقت ضائع کر رہا ہے! یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے کہ جس کا انکار حدیث و فقہ کی رُو سے بھی ناممکن ہے۔ لیکن اس کے باوجود ـــــ دیکھ لیں! اسلامی جمہوریہ پاکستان کا شاید ہی کوئی ایسا دفتر ہوں جہاں مٹھی گرم کئے بغیر کام ہو جائے۔ نام اس کا رکھا ہوا ہے چائے پانی!

عقائد و رسومات کے علی الرغم علم و حکمت کی دنیا ہے، جس کا شعار تحقیق و جستجو ہے! اس دنیا میں رہنے والے حقائق کو خواہ یہ وحیٔ خداوندی ہو یا انسانی مشاہدے اور تجربے کا نتیجہ

لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ـــــ

خوب چھان پھٹک کے بعد تسلیم کرتے ہیں، یونہی اندھے یا بہرے بن کر ان پر ٹوٹ نہیں پڑتے! تحقیق و جستجو کی روش انسان میں جرأت، بے باکی اور بالغ النظری پیدا کرتی ہے۔ ایسے ماحول میں نشوونما پانے والے افراد کو زبردست قوتِ نفس حاصل ہوتی ہے۔ یہ ہر بات کو خلوص اور توجہ سے سنتے اور اس پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں اور یہ ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں علم و بصیرت کی رُو سے سمجھایا جا سکتا ہے۔ **بایں نمط یہ بخوبی کہا جا سکتا ہے کہ مسئلہ ربٰو کو سمجھنے یا سمجھانے کا نہیں بلکہ اصل مسئلہ ذہنیت کا ہے۔**

ربٰو سے متعلق ہمارا علم عقائد و رسومات پر مبنی ہے اور اس پر عمل ہمارے جذبات کا تقاضا ہے! ہم جو ربٰو کو حرام سمجھتے ہیں اور ایسے ہر کاروبار سے نفرت کرتے ہیں جو ربٰو پر مشتمل ہو ـــــ اس لئے نہیں کہ ہم کسی گہری تحقیق اور وسیع تجربے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہوں۔ یعنی یہ کہ ربٰو کا کاروبار حقیقتاً انسانی رشتوں اور معاشرتی استحکام پر بُری طرح اثر انداز ہوتا ہے یا یہ کہ اس کاروبار سے انسانی ذات میں ثبات کی بجائے بودا پن پیدا ہو جاتا ہے! ربٰو سے ہمارا بَیر دراصل اس لئے ہے کہ قرآنِ کریم نے اسے اللہ اور رسولؐ کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دے رکھا ہے۔ قرآنِ کریم پر ہمارے ایمان کی نوعیت اس طرح ہے کہ جس طرح ایک ہندو گیتا پر ایمان رکھتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اندھی اور شدید! ایک ہندو بھی اپنے دین پر علم و بصیرت اور عقل و فکر کو بالائے طاق رکھ، محض جذباتی طور پر عمل پیرا ہوتا ہے اور یہی کچھ ہم بھی کرتے ہیں۔ ایسے ایمان کی جو درگت بنتی ہے، ہندو کے ہاں تو وہ ضرب المثل بن چکی ہے، لیکن ہماری حالت بھی کوئی ڈھکی چھپی نہیں۔ رشوت کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ چند اور مثالیں ملاحظہ فرمائیے! ہمارا ایمان ہے کہ خدا جھوٹوں پر لعنت بھیجتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود جب تک

دن بھر میں ہزار جھوٹ نہ بول لیں ہمارا جی نہیں بھرتا۔ ہمارا ایمان ہے کہ غیبت کرنا، مُردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف ہے، لیکن اس کے باوجود ہم دوسروں کی پیٹھ پیچھے ان کی عیب جوئی کرتے ہیں اور ذرہ بھر کراہت محسوس نہیں ہوتی۔ ہم میں سے کون نہیں جانتا کہ ایک مسلمان کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان کو کسی بھی طرح کی اذیت، رنج یا تکلیف نہیں پہنچنی چاہیئے، لیکن اس کے باوجود شاید ہی کوئی خوش نصیب ہو جو ہماری دست درازیوں اور ریشہ دوانیوں سے محفوظ ہو۔

قول و فعل کا یہ بھیانک تضاد جسے عرفِ عام میں ایمان کی کمزوری کہا جاتا ہے دراصل بلاتحقیق ایمان کی بنا پر ہوتا ہے۔ ایسے ایمان کو پیدائشی ایمان بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی بچّے کو خواہ سمجھ آئے یا نہ آئے ہم نے اس کے کان میں اذان ضرور دینی ہوتی ہے! ربٰو ہو یا کوئی دوسری معاشرتی برائی۔ اگر ہمارا ایمان علیٰ وجہ البصیرت ہے اور ہمیں بالتحقیق علم ہو کہ ان کی خلاف ورزی کی پاداش میں معاشرہ جہنّم بن جائے گا تو یقین جانیئے شاید ہی کوئی بدبخت ہو جو اس جہنّم میں چھلانگ لگائے! علیٰ وجہ البصیرت ایمان کی نوعیت ہی کچھ اور ہوتی ہے؟ گلیلیو سے جب کہا گیا کہ اگر یہ ایک لمحے کے لئے تسلیم کر لو کہ زمین ساکن ہے تو تم سزائے موت سے بچ سکتے ہو۔! اس نے کہا۔ میرے کہنے سے زمین رُک نہیں جائے گی اور پھر میں ایک ایسی حقیقت سے کیسے انکار کروں جسے میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ نبئ اکرمؐ سے کہا گیا کہ اگر آپ یہ عقیدہ تسلیم کر لیں کہ حضرت عیسٰیؑ خدا کا بیٹا ہے تو سب کی سب عیسائی برادری آپ کے ساتھ ہوگی۔ آپؐ نے عرض کیا کہ یہ عقیدے کی نہیں اصول کی بات ہے اور اصول یہ ہے کہ ایسی کوئی بھی ہستی جو کسی سہارے کی محتاج ہو وہ رحمانیت کے فرائض سرانجام نہیں دے سکتی۔ لہٰذا آپؐ نے بیانگِ دہل اعلان کر دیا کہ مجھے حکم ہوا:

قُلْ اِنْ کَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِیْنَ (۴۳/۸۱)

"اے رسول! ان سے کہو کہ اگر رحمٰن کا کوئی بیٹا ہوتا تو ایسے رحمٰن کا سب سے پہلے میں انکار کرتا۔"

[illegible]یات صرف وہی صاحبِ ایمان کہہ سکتا ہے جس کا ایمان علی البیّنات ہو۔

[illegible]سے متعلق جو مسائل اور پیچیدگیاں سامنے لائی جاتی ہیں وہ درحقیقت اس ذہنیت کی عکاسی کرتی ہیں جو جذبات اور عقائد و رسومات کے تابع پروان چڑھتی ہیں۔ ورنہ اس باب میں کوئی ایسا نقطہ نہیں جو مشکل ہو اور سمجھ سے بالاتر۔ قرآنِ کریم میں اس موضوع کو نہایت شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر ربٰو کا نظام قرآنِ کریم کے معاشی نظام کی ضد ہے اور یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ وہ موضوعات جن کی اضداد موجود ہوں وہ نہایت واضح ہوتے ہیں۔ اضداد حقائق کو موتیوں کی طرح نکھار دیتی ہیں۔ مثلاً رات اور دن ایک

دوسرے کی ضد ہیں لہٰذا ان دونوں کے تصور میں کسی طرح کا ابہام نہیں پایا جاتا۔ قرآنِ کریم نے اپنا معاشی نظام ربٰو کے نظام سے بھی زیادہ تفصیل اور وضاحت سے بیان کیا ہے لیکن اس نظام میں جس قربانی اور ایثار کا مطالبہ کیا گیا ہے وہ ہمیں گوارا نہیں۔ لہٰذا 'من حرامی حجتاں ڈھیر' کے مصداق ہم جدھر سے پلٹتے ہیں ربٰو کی پیچیدگی کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ ہماری حیوانی جبلّت "تحفظِ خویش" کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے مفادِ عاجلہ کو یقینی بنائیں۔ ایک بچہ دس تھپڑ کھا کر بھی خاموش رہے گا بشرطیکہ ماں اسے دودھ پلا دے، ورنہ دلائل و براہین کی رُو سے، دن رات کوشش کی جائے، اسے چپ نہیں کرایا جا سکتا۔ ربٰو کا نظام چونکہ ہمارے مفادِ عاجلہ کو یقینی بناتا ہے لہٰذا، اسے قائم و دائم رکھنے کے لئے ہم سب کچھ برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ یہ میرا خیال ہی نہیں، بلکہ اس ربِ جلیل کا قولِ صادق ہے جو دلوں کے حالات بخوبی جانتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

مَا يُجَادِلُ فِيٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ۝ (۴۰/۴)

احکامِ خداوندی کو سمجھنے یا نہ سمجھنے کی بحث محض بہانہ ہوتی ہے۔ ان سے انکار کی اصل وجہ زندگی کی چہل پہل اور رنگینیاں ہیں۔ لمبی لمبی کاریں، عالیشان کوٹھیاں، زرق برق لباس اور ما ملکت ایمانھم کے فرشی سلام لوگوں کو یہ مغالطہ ہو جاتا ہے کہ یہ سب سہولتیں اور آسائشیں صرف ربٰو کے نظام میں ہی ممکن ہیں۔ خدائی نظام میں انہیں ماسوائے لوٹے اور مصلّے کے کچھ نظر نہیں آتا۔ ان سہولتوں کو وہ ترک نہیں کر سکتے، لہٰذا بحث چھڑ جاتی ہے کہ ربٰو کیا ہے اور اس کی کون سی شکل حرام ہے؟ سود مفرد، سود مرکب، سود شرطیہ، سود مدتیہ، سود خطریہ وغیرہ وغیرہ سب ایسی ہی ذہنیت کے حامل افراد کی تراشیدہ اصطلاحیں ہیں۔ سوائے رسولؐ! کہیں ان حضرات کی ظاہری پھوں پھاں تمہیں تمہارے مشن سے غافل نہ کر دے!

ہماری بدبختی یہ ہے کہ ہم گو مسلمان ہیں　　اس کے باوجود قرآنِ کریم نہیں پڑھتے اور بہت کم ایسے افراد ہیں جو قرآنِ کریم کے حقائق پر آزادانہ طور پر غور و فکر کرتے ہوں۔ اکثریت نے اسلاف کا قلادہ گلے میں ڈال رکھا ہے اور آج چودہ سو سال کے بعد بھی انہی کی عقل و بصیرت کی روشنی میں حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کائنات میں عقل کی نشو و نما کا یہ عالم ہے کہ وہ آئے دن نکھرتی چلی جا رہی ہے۔ لہٰذا، ایک پست شئے کا ایک بلند شے سے نباہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ آج کے تقاضوں کو چودہ سو سال پرانی عقل سے سمجھنا اور حل کرنا کسی طور ممکن نہیں۔ وحیٔ خداوندی کی غرض و غایت بھی انسانی عقل کی یہی بے بسی تھی۔ "آج" اور "کل" کی عقل میں جو بُعد پایا جاتا ہے اُسے صرف وحیٔ خداوندی پاٹ سکتی ہے۔ ارشاد ہے:

حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ

قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝

قابلِ حمد و باعثِ شرف و مجد! قرآنِ کریم ہی ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جو انسان کو شرفِ زندگی سے ہمکنار کر سکتا ہے اس لئے قابلِ تعریف بھی! یہ خدائے رحمٰن و رحیم کی جانب سے تنزیل ہے۔ یعنی اس کا نزول نوعِ انسان کی نشوونما کے تقاضوں کے مطابق ہوا ہے۔ اس کرۂ ارض پر پہلے انسان سے لے کر حضور نبئ اکرمؐ کے دورِ ہمایونی تک جیسے جیسے انسانی نشوونما کے تقاضے بدلتے رہے خدا کی رہنمائی ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے بتدریج آتی رہی اور بالآخر اسے قرآنِ کریم کی دفتین میں ایسے منفرد اور سلیس انداز میں محفوظ کر دیا کہ آنے والا ہر دور اس سے مستفیض ہو سکے! (۹۱/۱-۳)

خدائے رحمٰن و رحیم کی اس حسین وضاحت کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ کوئی انسان جو قردۃً خاسئین کی سطح سے ذرا سا بھی بلند ہو وہ زندگی کے کسی مسئلے کو قرآنِ کریم کی روشنی میں سمجھ نہ پائے۔

قرآنِ کریم پر ہمارا اندھا دھند ایمان ہے۔ اس کی تعلیمات کو ہم بلا سوچے سمجھے قبول کرتے ہیں۔ ربوٰ کے متعلق ہمیں بھی ایسا ہی ایمان ہے۔ ہم اسے اس لئے حرام سمجھتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ اس کی بین سکتی۔ بالفرض آج اگر کوئی یہ ثابت کر دے کہ ربوٰ قرآن کی رُو سے حرام نہیں تو یقین جانئے ہم اس پر جشنِ مسرت منائیں گے۔ ہمیں ربوٰ کے ان مضرات کا علم ہی نہیں جن کی بنا پر قرآنِ کریم نے اُسے حرام قرار دیا ہے۔ ہمیں کبھی نہیں بتایا جاتا کہ معاشرے کی نشوونما اور انسانی ذات پر ربوٰ کے کیا بد اثرات مرتّب ہوتے ہیں۔ ربوٰ سے متعلق ہماری جتنی بھی تحقیق ہے وہ محض اپنے ایمان کی سچائی کے ثبوت میں ہے۔ جس طرح ایک ہندو اپنی بُت پرستی کو سچا ثابت کرنے کے لئے ہزاروں کتابیں لکھ ڈالے۔ ہمارے ہاں ربوٰ پر بیشتر لٹریچر ایسی ہی نوعیت کا ہے۔ یوں بھی یہ ایک عام حقیقت ہے کہ ہم مسلمان تحقیق کے عمل سے بہت دُور ہیں۔ ایک ربوٰ پر ہی کیا موقوف زندگی کے ہر پہلو پر ہماری نگاہ محققانہ نہیں ہوتی۔ ہم یا تو عقائد کی روشنی میں عمل کرتے ہیں یا پھر جذبات کے تابع! یہ ہماری پیدائشی کمزوری ہے جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ اگر ہماری نشوونما اور تربیت قرآنِ کریم کی خالص تعلیمات اور اصولوں کے تابع ہوتی تو آج ہم دنیا میں صفِ اوّل کی اقوام سے بھی دو قدم آگے ہوتے۔ ہمارا منصب تھا ـــــ اِمَامًا لِّلنَّاسِ! ـــــ ہماری سب الجھنیں دُور ہوتیں، سب مشکلیں آسان اور ہمارے سب مسائل حل ہوتے! بُش، بورس، میجر، متراں ہمارے ایوانوں کی چوکھٹ پر دست بستہ حاضر ہوتے! نئے عالمی نظام کے علمبردار ہم ہوتے! اس وقت نوعِ انسان بھوک و خوف کے جس عذابِ الیم میں مبتلا ہے اُسے بچانا ہمارا فریضہ تھا۔ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝

علم و تحقیق کی کمی کیا گُل کھلاتی ہے، اسے ربٰو کے پس منظر میں ہی دیکھا جائے تو انتہائی بھیانک صورت سامنے آتی ہے۔ آپ کسی مسلمان بھائی کو کھڑا کر کے پوچھیں، سود کیا ہے؟ فوراً جواب دے گا۔ سود حرام ہے اس کے بعد پوچھیں، حلال کیا ہے؟ تو لبوں پر سوائے کھسیانی مسکراہٹ کے کچھ دکھائی نہیں دے گا! قرآن کریم جب کسی منکر کی نفی کرتا ہے تو لازماً اس کا معروف بھی پیش کرتا ہے۔ قرآن کریم ربٰو کا ایک متبادل نظام پیش کرتا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ وہ نظام کیا ہے؟ لیکن اس سے پہلے ایک بار پھر سے ربٰو کا جائزہ لیتے ہیں۔ تاکہ بات مزید واضح ہو جائے۔ نزولِ قرآن کے دور میں ربٰو کا نظام اپنے عروج پر تھا۔ یوں سمجھئے کہ معاشرے کی رگ رگ میں رچا بسا تھا اور لوگ اس سے یوں مانوس تھے جیسے کوئی اپنی اولاد سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے قرآنِ کریم اپنے نظام کے بالمقابل اس کی زیادہ تفصیل میں نہیں جاتا بلکہ اسے مختصراً مگر جامع الفاظ میں ترک کر دینے کی تلقین کرتا ہے۔ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ (۲/۲۷۸)

قرآنِ کریم کے مطابق ربٰو کے نظام میں انسان نفسیاتی مریض بن جاتا ہے۔ اس میں انسانی صفات دب جاتی ہیں اور حیوانی خواہشات غالب آجاتی ہیں۔ مال و زر کی ہوس اس کے تن بدن میں آگ لگا دیتی ہے، خوف و یاسیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ یعنی جب تک دولت حاصل نہیں ہوتی، مایوس رہتا ہے اور جب حاصل ہو جاتی ہے تو پھر اس کے لٹ جانے کا خوف مسلط ہو جاتا ہے۔ ہمہ وقت ہیجان اور ذہنی تناؤ (TENSION) کا شکار رہتا ہے اور کسی پل بھی چین نصیب نہیں ہوتا ــــ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ط ــــ جیسے کسی کو سانپ ڈس لے!!! سود خور کی نفسیات میں صرف یہی کمزوریاں پیدا نہیں ہوتیں بلکہ وہ حلال و حرام میں تمیز کرنے کے قابل بھی نہیں رہتا۔ پھر وہ بیع جیسے حلال عمل کو بھی مثل الربٰو سمجھتا ہے۔ بظاہر بیع و ربٰو کا عمل مثل دکھائی دیتا ہے۔ لیکن فی الحقیقت دونوں میں ایک نہایت باریک مگر عظیم بنیادی فرق پایا جاتا ہے اور وہ ہے ذہنیت کا فرق! بیع کے عمل میں حقوقِ ملکیت کی منتقلی اور انسانی محنت کا معاوضہ شامل ہوتا ہے جس سے سکونِ قلب اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ جب کہ ربٰو کے معاملہ میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔ یہ سودی ذہنیت کا ہی کرشمہ ہے جو بنک کے بارہ فیصد کو تو حرام قرار دیتی ہے لیکن تاج کمپنی کے تیس فیصد کو حلال و طیب! اس پر جتنی بحث کر لیں آپ ایک مسلمان کو بھی قائل نہیں کر سکیں گے کہ یہ دونوں سود ہیں۔ دونوں میں اصل زر بھی محفوظ ہے اور اس پر بڑھوتری بھی یقینی ہے۔ دونوں کا انسان کی ذہنی نشوونما پر برابر کا اثر ہوتا ہے اور دونوں سے ایک جیسی نفسیات۔ یعنی ہڈ حرامی کی نفسیات جنم لیتی ہے! جنرل احسان میرے محترم بزرگ اور تحریک قرآنی کے سابقون الاولون میں سے ہیں۔ آپ سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے تو قرآنِ کریم کے حوالے سے کوئی نہ کوئی خوبصورت بات سامنے آجاتی ہے۔ آپ سے کسی نے پوچھا، کیا سودِ مفرد جائز ہے؟ آپ نے کہا، تم سودِ مفرد اور

سود مرکب کی بات کرتے ہو۔ جب کہ اللہ میاں تو اصل زر لینے کو بھی ناپسند کرتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اصل زر کے بارے میں ارشاد ہے۔ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ

حقیقت یہ ہے کہ ربٰو کا سارا نظام ظلم و استحصال پر مبنی ہے۔ جب کہ قرآنِ کریم کا مشن ظلم کو مٹانا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بنکوں میں جو سودی کاروبار ہوتا ہے اس سے کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک ایسا کہنا غلط فہمی اور سطحی سوچ کا نتیجہ ہے۔ کسی سے دس بیس روپے زیادہ اینٹھ لینا یقیناً زیادتی ہوتی ہے لیکن قرآنِ کریم کے نزدیک اس سے بھی زیادہ بھیانک ظلم وہ ہے جس سے انسانی صلاحیتیں مسخ ہو جائیں۔ سودی کاروبار کسی شکل میں بھی ہو اس سے انسانی صلاحیتیں قطعی نشوونما نہیں پاتیں اور یہ سب سے عظیم ظلم ہے۔ اسی لئے کہا کہ اگر سودی کاروبار سے باز آجاؤ تو نہ تو تم پر ظلم ہوگا اور نہ تم کسی پر ظلم کے مرتکب ہوگے ـــــ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۚ

قرآنِ کریم میں ارشاد ہے کہ ان مظالم اور ناہمواریوں کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ سود پر مبنی نظام کو مٹا کر اس کی جگہ صدقات پر مبنی نظام کو فروغ دینا چاہتا ہے۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۝ (۲/۲۷۶)۔

صدقات پر مبنی معاشی نظام ـــــ نوعِ انسان کے لئے ایک بالکل نیا اور نامانوس نظام تھا۔ نہ آج اور نہ اس دور میں یہ بات انسان کے حیطۂ تصور میں آسکتی تھی کہ کوئی معاشی نظام ایسی بلند ذہنیت کا علمبردار بھی ہو سکتا ہے کہ جس میں لوگ ایک دوسرے کی ضروریات پوری کریں لیکن صلے یا شکریے کی تمنا نہ رکھیں۔ جس میں لوگ صرف اپنی محنت کا معاوضہ لیں، وہ بھی حسبِ ضرورت لیں اور زائد از ضرورت کو منفعت عام کے لئے ثمردار درخت کی طرح کھلا رکھیں۔ جس میں صاحبِ صلاحیت اور صاحبِ استطاعت حضرات اپنی ہر ضرورت اور اپنے ہر مفاد سے بلند ہو کر دوسروں کی پرورش کی فکر کرتے ہوں ـــــ

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝

اور وہ ایسا انتظام کرتے ہیں کہ جو لوگ کام کاج کے قابل نہ رہیں یا جو معاشرے میں تنہا رہ جائیں یا جو کسی اور مصیبت میں مبتلا ہو جائیں، انہیں سامانِ رزق بہم پہنچتا رہے۔ وہ یہ سب کچھ خالصتہً لوجہ اللہ کرتے ہیں اور کسی کے سر پر کوئی احسان نہیں دھرتے۔ وہ جن کے لئے

یہ کچھ کرتے ہیں ان سے صاف صاف کہہ دیتے ہیں، ہم اُسے اپنا فریضہ سمجھتے ہیں اور اس
کے بدلے میں کچھ نہیں چاہتے حتیٰ کہ ہم شکریے تک کے بھی متمنی نہیں۔ (۹ - ۸/۷۶)۔

کیا کوئی سود خور ایسا سوچ بھی سکتا ہے، نہیں۔ دوسروں کے ساتھ حسن سلوک سے وہی پیش آسکتا ہے جس کا سینہ جوہرِ انسانیت سے معمور ہو، جو اخلاقِ کریمانہ کا پیکر ہو، جو دوسروں کی امداد میں خوشی محسوس کرے۔ ربٰو کے نظام میں جو انفرادی اور معاشرتی نفسیات جنم لیتی ہے اس سے ہم بخوبی آگاہ ہیں۔ اس وقت ہم ربٰو کے نظام کے تابع زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم سے ہر کوئی اپنی ذہنی کیفیت کا اندازہ کر سکتا ہے۔ ایک کے دو اور دو کے بیس بنانا ہماری فطرت بن چکی ہے۔ لالچ، حرص، حسد، نفرت، جلن اور ایسے جیسی ہمارے خون میں سرایت کر چکی ہے۔ ہم میں سے ہر ایک قنوطیت اور یاسیت کا شکار ہے۔ سوائے اپنی ذات کے ہم ہر ایک سے نفرت کرتے ہیں۔ نہ کسی کو ہنستا اور نہ کسی کو روتا دیکھ سکتے ہیں۔ ان اوصاف کے ساتھ ہم کوشش کرتے ہیں کہ قرآنی نظام کو سمجھ سکیں قطعی ناممکن ہے!

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ نزولِ قرآن کے دور میں ربٰو کا نظام اپنے جوبن پر تھا اور لوگ اس کی ایک ایک چال سے واقف تھے۔ اس دور میں سب سے زیادہ دشواری صدقات پر مبنی نظام کو سمجھانے کی تھی۔ یہ ایک نیا نظام تھا اور لوگ اس سے آگاہ نہیں تھے کہ صدقات ہوتے کیا ہیں؟ اسی لئے قرآنِ کریم نے ربٰو سے زیادہ صدقات پر بحث کی ہے۔ اس قدر تفصیلی تشریح کا تقاضا تھا کہ آج مسلم معاشرے میں صدقات پر مبنی ایک مربوط نظام قائم ہوتا۔ لوگ ربٰو کے نام تک سے ناآشنا ہوتے اور اسلامی معاشرے سے اس کا وجود حرفِ غلط کی طرح مٹ چکا ہوتا۔

وائے ناکامی! جسے ایک سسٹم کی شکل لینی تھی وہ تو ٹھہرا "کالا بکرا کاٹنا" یا "کالی ہنڈیا کا چڑھانا" یعنی صدقہ ایک رسم کے طور پر ادا ہونے لگا اور جسے ختم ہونا تھا وہ ٹھہرا خورشید کی مانند۔ ادھر ڈوبے، ادھر نکلے! مہاجن گئے بینک آ گئے، ابھی ان کے جانے کے آثار ہی نظر نہیں آتے کہ اوپر سے مشارکہ اور مضاربہ قدم جما رہا ہے! دن بدن ربٰو کا نظام مربوط و مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ قرآنِ کریم کے علی الرغم ربٰو بڑھ رہا ہے اور صدقات گھٹ رہے ہیں اور مسلمان محوِ تماشائے لبِ بام کھڑا ہے!

قرآنِ کریم نے اپنے ہر نظام کی، خواہ یہ معاشی ہو یا معاشرتی، اس کی بنیاد تغیرِ نفس پر رکھی ہے۔ اس کے مطابق جب تک قوم کی نفسیات نہیں بدل دی جائے، وہاں کوئی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی۔ تغیرِ نفس اس کا ایک نہایت اہم اور بنیادی اصول ہے۔ انسان کے اپنے وضع کردہ نظام انسان کی حیوانی جبلتوں کی برومندی کرتے ہیں، لہٰذا ان میں تغیرِ نفس کو کوئی خاص اہمیت نہیں حاصل ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ کا نظام انسان کو چونکہ حیوانی سطح سے بلند لے جانا چاہتا ہے لہٰذا اس میں تغیرِ نفس بہت ضروری ہوتا ہے۔ انبیاء کرام کا منصبی فریضہ قرار پاتا تھا کہ وہ قوم میں تغیرِ نفس برپا کریں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ قوم کی مناسب تعلیم و تربیت کا انتظام کرتے اور اگر

کسی جگہ کا ماحول سازگار نہیں تو وہ وہاں سے ہجرت کر جاتے۔ جغرافیائی ماحول اور معاشرتی طرزِ بود و باش دونوں نفسِ انسانی پر نہایت گہرے نقوش مرتب کرتے ہیں۔ اس سے انسانی سوچ اور اندازِ فکر کے زاویے بدل جاتے ہیں۔ تغیرِ نفس کے ضمن میں سب سے گہرا اثر نتائج کا ہوتا ہے۔ نتائج، چونکہ کسی دعوے کی صداقت کا عملی ثبوت ہوتے ہیں لہٰذا ان کا نفس کی تبدیلی پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے۔ ہمارے اربابِ بست و کشاد اگر وقتی طور پر ہی کچھ کر دکھائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ قوم پر بہت بڑا احسان ہوگا۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ قرآن کی تعلیمات کے مطابق کہیں سے بھی صدقات کا نظام شروع کر دیں۔ اس کے مثبت نتائج خود اس نظام کی صحت کا ثبوت بن جائیں گے۔ حکومت کے ایسے ادارے جو لوگوں کی فلاح کے سود پر رقم فراہم کرتے ہیں۔ مثلاً ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن، لیکن اگر لوجہ اللہ قرضہ حسنہ دینا شروع کر دیں تو کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔ بمشیتِ ایزدی بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔ رقوم فراہم کرنا تو بڑی بات ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اگر حکومت لوگوں کے چھوٹے چھوٹے مسائل ہی توجہ سے اور خلوص سے حل کرنا شروع کر دے تو معاشرے میں ایک نہایت خوشگوار تبدیلی رونما ہو جائے گی۔ عوام میں اتنی نفرت اور بغض دشمن کا پروپیگنڈا بھی پیدا نہیں کر سکتا جتنی کہ حکومت کی چھوٹی چھوٹی لغزشیں اور کوتاہیاں پیدا کر دیتی ہیں۔ ایسے سب اقدامات صدقات کے نظام کا حصہ ہوتے ہیں۔

تغیرِ نفس کے بغیر ربو کو معاشرے سے قطعی ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت پورا معاشرہ اس کی شدید لپیٹ میں ہے۔ یہ صرف معاشی نظام کا مسئلہ نہیں بلکہ مکمل سماجی نظام کی تبدیلی کا مقتضی ہے۔ معاشرے کو قرآنِ کریم کی خالص تعلیمات اور اصولوں کی روشنی میں تشکیل دینا پڑے گا۔ قرآنِ کریم کے مطابق زندگی بسر کرنے والوں کی نفسیات الگ خطوط پر متشکل ہونا شروع ہو جاتی ہے، ان میں وسعتِ قلب اور کشادہ نگہی پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے، یہ ہر ایک سے محبت کرتے ہیں، ہر کسی کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں اور ہر کسی کو اپنا سمجھتے ہیں۔ انہیں نہ تو نروس ٹینشن ہوتا ہے اور نہ ہی یہ کبھی مایوسی کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ انتہائی پُروقار اور پُربہار شخصیت کے حامل ہوتے ہیں۔ چہرے پر ہمہ وقت سکون و اطمینان کی جھلک، نگاہوں میں موتی کی سی چمک اور لبوں پر پھولوں جیسا تبسم، کشادہ جبین اور زیبا ہوتے ہیں۔ یہ راتوں کو چین کی نیند سوتے ہیں اور دن کو اطمینان کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ انہیں نہ خوف ہوتا ہے اور نہ حزن۔ اپنے تو اپنے غیر بھی ان کے لئے نیک تمنا رکھتے ہیں اور ان کی خوشی اور سلامتی کی دعائیں مانگتے ہیں۔ یہ اللہ کے دوست ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے ربو کیا انسانیت کی نشوونما میں حائل کوئی رکاوٹ بھی ہو، اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکتے ہیں۔

وما علینا الا البلاغ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

علی محمد چدھڑ

قرآن کا معاشی نظام

خالقِ کائنات کی سب سے پہلی اور بڑی صفت یہ ہے کہ وہ ربّ العالمین ہے۔ اس کی ربوبیت کے سامان اور اسباب اس قدر محیّر العقول ہیں کہ انہیں دیکھ کر عقل و بصیرت کا مالک ہر انسان تحسین و آفرین کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خداوند کریم نے یہ سارا سلسلۂ کائنات ہمارے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ اُسی کی رحمت ہے کہ ہمیں نشوونما کے تمام سامان میسّر ہیں۔ یہ اسبابِ زیست جو چار سُو نظر آ رہے ہیں یکساں طور پر اس نے تمام بنی نوعِ انسان کے لئے پیدا کئے ہیں۔ یہ بات بہت اہم ہے۔ اسلام کا سارا معاشی نظام اسی محور کے گرد گردش کرتا ہے۔ جب تقسیمِ رزق مساویانہ اور حسبِ ضرورت ہو گی تو دولت کا ارتکاز ناممکن ہو جائے گا اور سرمایہ داری کا امکان خود بخود ختم ہو جائے گا۔ قرآن میں ایسی تقسیم کے بڑے واضح احکام موجود ہیں۔ اِس کے ساتھ ہی عملی طور پر بھی کائناتی نظام میں ہمیں ایسی مثالیں ملتی ہیں جو قدرت کے اِس اصول کی صحت کا بیّن ثبوت ہیں مثلاً سورج سے حرارت اور روشنی کی تقسیم، ہَوا اور پانی کا یکساں استحقاق اور استعمال وغیرہ۔ قرآنی معیشت دو انتہاؤں میں ایک متوازن اور اعتدال کی راہ ہے۔ اس کا ایک زرّیں اصول یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کی کمائی میں سے جس قدر زیادہ دوسروں کی پرورش کے لئے دیتا ہے اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ جو شخص انسانی ذات پر ایمان رکھتا ہے۔ وہ پوری محنت سے کمائی کرتا ہے۔ لیکن اس میں سے صرف اتنا اپنے لئے رکھتا ہے جس سے اُس کی طبعی ضروریات پوری ہوں اور فاضلہ کمائی دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دیتا ہے۔ انسانی خاندان یا گھر کی مثال سامنے رکھیں جس کا سربراہ دن رات کام کرتا ہے، خود بھی کھاتا ہے اور کنبہ کے دیگر چھوٹے بڑے افراد کی ضروریات بھی پوری کرتا ہے۔ درخت کو لے لیں جس کی جڑیں زمین سے خوراک اور نمی حاصل کر کے اوپر کی تمام شاخوں بلکہ آخری کونپلوں تک ضرورت کے مطابق بانٹ دیتی ہیں۔ اس طرح اس کے پتے سورج کی حرارت اور ہَوا سے جو کچھ وصول کرتے ہیں حسبِ ضرورت روٹس تک پہنچ جاتا ہے۔

ہمارے جسم میں دل کے ذریعہ خون کی جو گردش ہے وہ بھی آخری اعضاء تک اسی اصول کے تحت ہوتی ہے۔ رزق کی اس مساویانہ اور حسبِ ضرورت تقسیم کو قرآن نے شہد کی مکھی کی زندہ مثال دے کر اور بھی واضح کر دیا ہے کہ وہ بیچاری کس طرح سارا دن دُور دراز کا سفر کر کے پھولوں کا رس چُوستی ہے اور پھر اپنی اس کمائی کو دوسروں کی ضروریات کے لئے اپنے مرکز ملّت یعنی چھتہ کے حوالے کر دیتی ہے۔ وہ اپنی اس ڈیوٹی میں کبھی سُستی اور سہل پسندی کا مظاہرہ نہیں کرتی۔

قارئین کرام! اِسی قسم کی اور مثالیں ہوں یا ہمارے روزمرہ کے مشاہدات، یہ تسلیم شُدہ حقائق ہیں جن سے انکار ممکن نہیں اور اگر اس سب کو ہم درست مانتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمارے قوانین کا سرچشمہ تو ایک ہی ہے۔ جب آپ طبیعی اصولوں کو مانتے ہیں تو پھر وحی کے ذریعہ جو انسانی دنیا کے لئے قوانین ہیں ان سے کس طرح انکار کر سکتے ہو۔ خدائی فرمان کے مطابق ہم مانتے ہیں کہ سورج سے جو سامانِ زیست یعنی حرارت اور روشنی تو یکساں طور پر سب کے لئے ہے۔ لیکن اس زمین کو جو تمام انسانوں کے لئے رزق کا ذریعہ ہے یکساں طور پر سب کی تسلیم نہیں کرتے۔ اس پر ہم نے طاقت کے بل پر مصنوعی اور ذاتی ملکیتیں جما رکھی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے نوعِ انسان کے لئے جو رزق فراوانی کے ساتھ روئے زمین پر بکھیر دیا ہے اس کے استعمال کا حق بھی تمام انسانوں کو ایک جیسا ہے۔ یہ اور اس قسم کی دیگر ہدایات جن کا تعلق ہماری معیشت سے بنتا ہے۔ خالق کائنات نے انسانی رہنمائی کے لئے قرآن میں درج کر دی ہیں انہیں آپ قرآن کے معاشی نظام کے راہ نما اصول کہہ سکتے ہیں اور ان کا مختصر سا خاکہ حسبِ ذیل ہے:۔

(۱) قرآن نے سونے اور چاندی کا ارتکاز منع کیا ہے اور دولت جمع کر کے گنتے رہنے والوں کے لئے بڑی تہدید آئی ہے۔ نظامِ سرمایہ داری بنی نوع انسان کا دشمن ہے اور اسلام میں اس کی قطعاً گنجائش نہیں۔ قرآن کہتا ہے قارون (نظامِ سرمایہ داری کا نمائندہ) اپنی ہنرمندی اور چابکدستی کے باوجود اس غلط نظام کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گیا اور کثرتِ دولت اس کے کسی کام نہ آئی۔

(۲) ایک چیز ہے سرمایہ اور دوسری ہے محنت۔ قرآنِ کریم کی رُو سے معاوضہ محنت کا مل سکتا ہے۔ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۵۳/۳۹)۔ جو نفع محض سرمایہ پر حاصل ہو وہ حرام ہے۔ اسے ربٰو کہا جاتا ہے اور وہ ایسا حرام ہے کہ اسے خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۳) سامانِ رزق (ذرائع پیداوار) کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اس کا حق ملکیت صرف خدا کو حاصل ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے رسولؐ! تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لئے کھلا رکھیں؟ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہے سب کا سب (۲/۲۱۹) اور یہ بھی کہ رزق کو تمام

ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رکھو۔ (۴/۱۰)۔

(۵) ایسا طریق اختیار نہ کرو جس سے تقسیم رزق غیر متوازن ہو جائے۔ تقسیم رزق حسبِ ضرورت اور مساویانہ سے اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔

(۶) قرآن کے معاشی نظام میں مرکزِ نظام خداوندی روئے زمین پر سب کے رزق کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔

(۷) قرآن کہتا ہے کہ مومنین دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں۔

(۸) قرآنِ کریم کے اس معاہدے کو پیشِ نظر رکھیں جس کی رُو سے اللہ نے مومنین سے اُن کا جان و مال بعوض الـ خرید لیا ہے (۹/۱۱۱) اور یہ خرید اسلام میں محض خیالی نہیں عملاً واقع ہوتی ہے۔

(۹) قانونِ خداوندی کا نفاذ مومنین کی جماعت کے ہاتھوں ہوگا اور جو ذمہ داریاں خدا نے اپنی طرف منسوب ہیں انہیں کے ذریعہ پوری ہوں گی۔ سب کے لئے استعداد کے مطابق روزگار مہیا کرنا بھی مملکت کی ذمہ دار ہے اور شق نمبر ۴ کے تحت وصولی کی مجاز بھی مملکت ہی قرار پائے گی۔

یہ تھا قرآن کے معاشی نظام کا ایک مختصر سا خاکہ اور چیدہ چیدہ راہ نما اصول، جن کی چار دیواری کے اندر زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اپنی جزئیات بھی طے کر سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ قرآن میں اور بھی بہت سے احکـ موجود ہیں جو یا تو انہی اصولوں کی تفصیل ہے یا پھر ان کا تعلق ابتدائی اور عبوری دَور سے بنتا ہے۔ بہرحال اگر نظام رائج ہو جائے تو یقیناً ہمارے تمام معاشی مسائل حل ہو جائیں گے۔ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو جائے اور بقول علامہ اقبالؒ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں خاموش ہو جائیں گی۔ اس کہتا ہے۔ ان صداؤں کا علاج محتاج اور مفلسوں کی جھولی میں بھیک کے ٹکڑے ڈال دینے میں نہیں۔ ا علاج باطل نظام کے اُکھاڑ دینے میں ہے۔ اس کے برعکس مروّجہ مذہب کا معاشی نظام کہتا ہے کہ مفلسی کا ایک جزوِ لازم ہے اور یہ تقدیرِ خداوندی ہے تاکہ دولت مند لوگ صدقہ اور خیرات دے کر ثواب حاصل کر ہمارے مولوی کا خیال ہے کہ اگر مفلسی نہ رہی تو صدقہ و خیرات کے متعلق تمام احکامِ شریعت معطّل ہو کر رہ جائیں اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا مروّجہ اسلام قرآن کے معاشی نظام کو تسلیم بھی کرتا ہے یا نہیں۔ زبانی کلامی تو حکمـ بھی فلاحی مملکت کا نعرہ دے رہے ہیں اور مذہبی پیشوائیت نے بھی اسلام کا جھنڈا اٹھام رکھا ہے لیکن اگر کے عملی پہلو کا جائزہ لیا جائے تو جواب نفی میں ملتا ہے۔ کوئی لاکھ انکار کرے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم نے قـ کے معاشی نظام سے فرار کے حیلے بہانے تلاش کر رکھے ہیں۔ جب دینِ خالص یعنی قرآن کی بات ہوتی ہے، حکمران، سرمایہ دار اور مولوی کا متحدہ محاذ ہمیں دین کی واحد شاہراہ سے ہٹا کر مذہب کی لاتعداد پگڈنڈیو پر ڈال دیتا ہے۔ صدرِ اوّل کے بجائے فقہی دور زیادہ پُرکشش بن جاتا ہے۔ جس میں حکمران کا تخت و تاج محلـ

اور ہاتھ بالکل محفوظ ہے۔ سرمایہ دار کے اربوں کے سرمائے کو جواز کا شرعی سرٹیفکیٹ مل جاتا ہے اور مذہبی علماء اپنی پیشوائیت کی مسند پر بیٹھ کر بزعم خویش خدائی مشن پورا کرتے ہیں۔ آپ غور فرمائیں کہ مروجہ اسلام کا ایک ایسا نظام جس میں ہزاروں ایکڑ کی جاگیریں، سینکڑوں فلک بوس عمارتیں، دکانیں اور لاتعداد کارخانے سما سکتے ہوں بھلا وہ قرآن کے معاشی نظام کو کیسے برداشت کرے گا۔

یہاں باہمی رواداری کا مسئلہ نہیں ہے۔ حق اور باطل کا سوال ہے۔ اسلام کو غیر اسلام سے نتھی کرنے کی سازش ہو رہی ہے۔ ہماری معیشت اسلامی نہیں۔ لیکن اسلامی سزائیں نافذ ہیں۔ ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سزائیں ہو رہی ہیں۔ کیا ایک غیر اسلامی معاشی نظام کے تحت ایسی سزاؤں کا جواز ممکن ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس قسم کے مذہب سے تو وہ سیکولر نظام بہتر ہے جو اسلام کو ایک ڈھال کے طور پر استعمال نہیں کرتا۔ اسی طرح رزق کی تقسیم حسبِ ضرورت مساویانہ طریقے سے اسلامی مملکت کا فریضہ ہے اور ہر فرد کی بنیادی ضروریات پورا کرنا بھی حکومت کی ذمہ داری میں شامل ہے۔ یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن ہے۔ جب سامانِ رزق اور ذرائع پیداوار مملکت کی تحویل میں ہوں۔ لیکن ہمارے ملک میں اس کے بالکل الٹ ہو رہا ہے۔ ذرائع پیداوار نج کاری کے تحت پرائیویٹ سیکٹر کو دیئے جا رہے ہیں اور یہی نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ہے کہ اتنے اتنے بڑے کارخانے مملکت سے لے کر چند سرمایہ داروں کی ذاتی ملکیت میں دے دیئے جائیں۔ اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ ہم قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود چاہتے یہ ہیں کہ اپنے ریاستی معاملات کے فیصلے انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی رُو سے کریں۔ یہ سب ایمان کی کمزوری ہے اور مکافاتِ عمل اور حیاتِ اُخروی پر عدم یقین کی نشانی۔ قرآن کا معاشی نظام ہماری زندگی میں اُس وقت آسکتا ہے۔ جب ایمانِ قلب کے اندر جاگزین ہو جائے۔ قلب و نگاہ میں تبدیلی آجائے۔ نفع نقصان کے معیار بدل جائیں اور ہم میں ایسا داخلی انقلاب پیدا ہو جو حضورؐ نے اپنی ابتدائی تیرہ سالہ مکی زندگی میں برپا کیا تھا اور پھر جس کی تربیت صدرِ اوّل کے آخر تک ہوتی رہی۔ محض خود ساختہ قوانین نافذ کرنے سے اسلام نہیں آیا کرتا اور نہ ہی ڈر کے بندھنوں سے ہم کوئی نظام بدل سکتے ہیں۔ البتہ اگر ایسا جذبۂ محرکہ پیدا ہو جائے کہ ہم بہ طیب خاطر قل العفو کے معیار پر پورے اتر سکیں۔ تو مطلوبہ معاشی نظام کی جانب پیش قدمی ہو سکتی ہے۔ استبداد کے ڈنڈے سے قائم کردہ کوئی نظام بھی زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتا۔ وہی نظام قائم رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے جو افرادِ معاشرہ کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔ موجودہ دور میں دنیا جن مالی مسائل اور ناہمواریوں میں گھری ہوئی ہے۔ ان کا حل سوچنے والا ایک انسان ہو یا ساری دنیا کے تمام دانشور، جب تک قرآن کے معاشی اور بنیادی اصولوں پر عمل نہیں ہوگا، مطلوبہ نتائج نہیں مل سکتے۔

سرمایہ داری ایک لعنت ہے اور استحصالی قوتوں کا یہ ایسا خود غرضانہ نظام ہے جو تمام ذرائع پیداوار پر قابض ہو کر نوعِ انسان کو بھوکوں مار رہا ہے اور جو مذہبی عناصر اس باطل نظام کے کلس پر اسلام کا پانی چڑھانا چاہتے ہیں، دراصل اسلام اور انسانیت دونوں کے دشمن ہیں۔ پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے اور اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ اخلاق اور انصاف کا تقاضا تھا کہ خدا کے ساتھ اپنے پیمان کو پورا کیا جاتا۔ اب نصف صدی بیت چکی ہے۔ ابھی تک وعدۂ فردا کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اسلام تو کیا اس کے آثار بھی نظر نہیں آتے۔ آجا کے ایک شریعت بل کا کھلونا ہمارے ہاتھ میں رہ جاتا ہے۔ جس کا حال بھی یہ ہے کہ ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا جو چیرا تو اک قطرۂ خون نکلا

اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں تمام فرقوں کا پرسنل لاء اپنا اپنا ہوگا اور مذہبی پیشوائیت کی اسلام کے دینِ واحد پر یہ سب سے بڑی فتح ہے۔ ان پھلے مانسوں سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر یہی کچھ کرنا تھا تو پھر پاکستان کے تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کچھ تو ہمیں متحدہ ہندوستان میں بھی مل سکتا تھا۔

قارئینِ محترم! ان حالات میں ہم قرآن کی معیشت کا جائزہ لیتے ہیں تو کوئی امید افزا صورت سامنے نہیں آتی۔ اگر سمت ہی درست نہ ہو تو منزل کا حصول کیسے ہوگا۔ اور سمت درست نہیں ہو سکتی جب تک ساری قوم کا زاویۂ نگاہ قرآن نہ ہو جائے۔ یہ بڑی کٹھن اور صبر آزما منزل ہے۔ اس کے لئے مدت کا تعین نہیں ہو سکتا۔ اگر حکمران یا موجودہ نسل اپنی معیشت کی اساس یک مشت طور پر قرآن کو نہیں بنا سکتی، تو کم از کم تدریجی طور پر اس کا آغاز تو ہو سکتا ہے۔ باقی اس نظام کی تکمیل کے لئے ہمیں آنے والی نسل کی تعلیم و تربیت اس انداز میں کرنی چاہیئے کہ قرآنی تصورِ حیات ان کی رگ و پے میں سرایت کر جائے۔ اس کا آغاز قرآن کے ایک متفقہ مفہوم کی تیاری سے ہو سکتا ہے تاکہ قوم میں دین کے متعلق یکسانیت اور واحدانیت کا تصور اجاگر کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ہمارے پاس مستند کتب اور دیگر لٹریچر کی کوئی کمی نہیں۔ قرآن کے معاشی نظام کی برکات ہم چھوٹے چھوٹے پمفلٹوں کی کثیر تعداد کی شکل میں سارے ملک میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یہ کام فری اور رضا کارانہ طور پر ہونا چاہیئے۔ یقین کریں! اس نشر و اشاعت میں جو کچھ بھی ہم خرچ کریں گے رائیگاں نہیں جائے گا۔ ہماری محنت اور پیسہ یقیناً بہتر نتائج پیدا کریں گے۔ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے اور جب کوشش دین کے لئے کی جائے تو کائناتی قوتیں بھی ساتھ ہو جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں کسی معجزہ کی توقع نہیں۔ ہماری مخالفت بھی ہوگی۔ مشکلات بھی آئیں گی۔ لیکن اسلام جب ہر شے سے عزیز ہو تو پھر انسان ان رکاوٹوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ دین ایک مسلسل جہاد کا نام ہے۔ جس کے لئے ہمارا طریق یہ ہونا چاہیئے کہ قرآنی اقدار عام کرتے ہوئے آگے بڑھتے جائیں جہلاء سے کنارہ کش رہیں اور اپنی سیرت و کردار سے لوگوں کو متاثر کریں تو ان میں معیشت کے متعلق ایسے احکام

بھی موجود ہیں جن کی تعمیل انفرادی طور پر بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً معذور اور بے سہاروں کی امداد، غریب اور محتاج عزیزوں کا خیال، نادار مقروض بھائیوں کے قرض کی ادائیگی اور بھوکوں کو کھانا وغیرہ ایسے امور ہیں جو صاحبِ ثروت حضرات موجودہ حالات میں بھی سرانجام دے سکتے ہیں۔ خداوندکریم مومنین سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنی ضروریات پر دوسرے ضرورت مندوں کی ضروریات کو ترجیح دیں۔ اگر کچھ کرنے کا جذبہ موجود ہو تو اس اصول کا دائرہ کار انفرادی طور پر بھی بڑا وسیع ہو جاتا ہے۔ لوٹ کھسوٹ بد دیانتی اور خیانت سے اجتناب انفرادی اور اجتماعی دونوں صورتوں میں ممکن ہے۔ اپنی حلال کی کمائی سے تبلیغِ دین اور قرآنی احکام کی نشر و اشاعت بھی مستحسن ہے۔ لیکن اگر ہم مذہبی علماء و مشائخ کی پرورش کریں گے تو ہماری یہ حرکت احیائے اسلام کے خلاف جائے گی۔ اس لئے کہ یہ حضرات جو بذاتِ خود کوئی کام نہیں کرتے اور دوسروں کی کمائی پر گلچھرے اڑاتے ہیں، دین کے لئے رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ اور دیگر لوگوں کو بھی اسلام کی طرف آنے نہیں دیتے۔ بدقسمتی سے جو لوگ مختلف فرقوں کے مذہبی مدارس کی مالی امداد کرتے ہیں یا پھر ہمارے حکمران بھی گرانٹ کے طور پر کروڑوں روپے کے عطیات ایسے اداروں کو مہیا کرتے ہیں۔ دراصل ایسی تمام ادائیگیاں اور دیگر اخراجات دین اسلام کی مخالفت کی مد میں آئیں گے۔ بات گو عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن درست اور قابلِ غور ہے۔ جس مذہبی نظام نے اغیار کی سازشوں سے دینِ خداوندی کو ختم کر دیا۔ قرآن کو ایک مہجور کی حیثیت دے کر پسِ پشت ڈال دیا۔ وحی کے اس آخری نظام کی برکات سے مخلوقِ خدا کو محروم کر دیا۔ کیا اس کی سرپرستی یا کفالت دین دوستی خیال کی جائے گی ؟ اور پھر یہ سب کچھ سہواً یا بزعمِ خویش نہیں۔ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ہو رہا ہے۔ حکمران اور مذہبی علماء اچھی طرح جانتے ہیں کہ دینِ خداوندی کا نفاذ آمریت اور پیشوائیت کا خاتمہ ہے۔ قرآن سرمایہ داری کا دشمن ہے۔ اگر صدرِ اوّل پلٹ آیا تو پھر یہ تینوں مٹ جائیں گے۔ لہٰذا سرمایہ دار، جاگیردار اور حکمران طبقے کی خواہش بلکہ کوشش ہے کہ مذہبی پیشوائیت کی آشیرباد کے ساتھ مروجہ اسلام ہی قائم رکھا جائے اس سے نہ صرف ان کا اپنا وجود بلکہ سرمایہ، اقتدار، جاگیریں اور تقدس سب کچھ محفوظ رہے گا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی ہم دین کے لئے کچھ کرنے کا آغاز کریں گے یہ طاغوتی طاقتیں ہمارے خلاف صف آراء ہو جائیں گی۔ ان حالات میں مطلوبہ نظامِ معیشت کا قیام آسان نہیں ہے۔ البتہ مایوسی کی بھی کوئی وجہ نہیں ہماری تحریک کوئی سیاسی تحریک نہیں ہے۔ پھر بھی موجودہ سیاست سے دامن بچاتے ہوئے ہم دینِ حقّہ کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے بتدریج نمائندگانِ مملکت کو قائل کر کے اعتماد میں لیا جا سکتا ہے۔ اگر ہمارے صدرِ مملکت جرأت سے کام لے کر خالص دینی جذبہ کے تحت ایک آرڈی نینس کے ذریعہ جاگیریں اور مذہبی فرقے ختم کر دیں تو سمجھیں آدھا فاصلہ طے ہو گیا۔ باقی کام کے لئے ہمیں وزیرِ اعظم اور دیگر وزراء کرام سے وفود اور خط و

کتابت کے ذریعہ رابطہ کی ضرورت پڑے گی۔ سو اس قسم کا رابطہ بھی ہمارے مقصد کے لئے سود مند ہوگا۔ اس سلسلہ میں رائے عامہ کو اپنے حق میں ہم خیال اور ہموار کرنے کی کوششیں بھی بار آور ہو سکتی ہیں۔ اور جب اس طرح سے ہر طرف قرآن کی روشنی آجائے گی تو کام آسان ہو جائے گا۔ آخر ایک وقت ہم بھی اندھیرے میں تھے۔ جن قرآنی دلائل نے ہمیں دین سکھایا اس سے دوسرے بھائی کیوں نہ مستفید ہوں۔ قبل ازیں ہم ادارہ طلوعِ اسلام سے اپنے ذاتی مطالعہ کے لئے کتب اور رسائل لیا کرتے تھے۔ آج اپنے تمام پیمان کی تجدید اور عزائم کو یک جا کرتے ہوئے ہمیں عہد کرنا ہے کہ اپنی استطاعت کے مطابق دوسروں کے لئے بھی قرآنی لٹریچر خریدیں۔ گھر گھر تقسیم کرنے کے لئے۔ مختلف لائبریریوں میں رکھنے کے لئے۔ وکلاء حضرات، طلباء اور دیگر دانش مند طبقات میں بانٹنے کے لئے۔ اس طرح جب دنوں، مہینوں اور سالوں کے بعد قومی قلب و نگاہ میں تبدیلی آگئی تو مطلوبہ نظام کے نفاذ کے لئے سرکاری مشینری یا انتظامیہ کی تشکیل آسان ہو جائے گی۔ یہ وہ وقت ہوگا جب ہم قرآن کے نظامِ معیشت کا مسوّدہ قومی اسمبلی یا مجلسِ شوریٰ میں پیش کر سکیں گے۔ یقین رکھیں باطل کی قوتوں میں کوئی دم خم نہیں ہوتا۔ ہمارے پاس دلائل ہیں۔ حقائق ہیں اور سب سے بڑھ کر قرآن ہے۔ انشاء اللہ تمام رکاوٹیں ریت کی دیوار ثابت ہوں گی۔

قرآنی حقائق کو سمجھنے کے لئے

ماہنامہ

طلوعِ اسلام لاہور

خود پڑھئے

اور

دوسروں کو پڑھنے کی ترغیب دیجئے

محمد اسلم رانا ۔ ڈنمارک

چراغ تلے اندھیرا

جانے وہ کیسے لوگ تھے جو مل کے ایک بار
آنکھوں میں جذب ہو گئے دل میں سما گئے

کائنات کتنی وسیع ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا' لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ کائنات اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود انسان کے اندر سمائی ہوئی ہے۔

قرآنِ پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

"انسان میں اس امر کی امکانی استعداد رکھ دی گئی ہے کہ یہ ان قوانین کا علم حاصل کر سکے جن کے مطابق مختلف اشیائے کائنات سرگرمِ عمل ہیں۔ چنانچہ ملائکہ سے کہا گیا کہ اگر تم اپنے خیال میں سچے ہو کہ یہ جدید مخلوق تمہارے مقابلے میں فروتر ہے' تو بتاؤ! کہ تمہیں بھی یہ استعداد حاصل ہے۔ (۲/۳۱) مفہوم القرآن۔

اب اگر حضرتِ انسان اپنی ان صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے اندر کی کائنات اور خارجی کائنات میں ہم آہنگی پیدا کر لے' تو وہ تمام قوتیں (ملائکہ) جن کا یہ مسجود ہے اس کے ایک ادنیٰ اشارے پر اس کی منزلِ مقصود اس کے قدموں میں ڈال دیں۔ بقول علامہ اقبالؒ:۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

یہ انسان کا اختیار و ارادہ ہی ہے جس سے یہ دیگر کائنات سے ممتاز اور متمیز ہے۔ انسان کے علاوہ اور کسی مخلوق میں یہ قوت ہی نہیں کہ وہ جس نہج و اسلوب پر چلنے کے لئے پیدا کی گئی ہے' اس سے سرکشی و انحراف اختیار کرے' لیکن انسان کو سجدہ ریزی اور سرکشی' دونوں کی قوتیں ودیعت کر دی گئی ہیں۔ یہی قوت اس کی سرفرازی اور سربلندی کا باعث ہے۔ اس سے یہ مسجودِ ملائکہ اور مخدومِ خلائق ہے ۔۔۔ کشمکشِ حیات میں پُرکیف جاذبیتیں ہیں' تو اسی کے دم سے اور کشاکشِ

زندگی میں رنگین کیفیتیں ہیں، تو اسی کے دم سے۔ بربطِ ہستی کے تاروں میں خوابیدہ نغمے بیدار ہوتے ہیں، تو اس کے جوش سے سینۂ کائنات میں ایک دھڑکنے والا دل ہے، تو اسی کے تموّج سے اور اگر اس دل میں مچلنے والی آرزوؤں کی رسیلی بجلیاں ہیں، تو اس کے تحرک سے۔ غرض انسان، انسان ہے، تو اسی کی بدولت اور یہ دنیا ہے، تو اسی کی بدولت۔ اگر یہ اختیار و ارادہ نہ ہوتا، تو انسان پتھر کا بُت ہوتا یا اشیائے کائنات میں سے کوئی شے، مسجودِ ملائکہ و مسخرِ کائنات کبھی نہ ہوتا۔

نیکی وہی نیکی ہے جو بدی کی قدرت رکھتے ہوئے عمل میں آئے۔ اطاعت وہی اطاعت ہے جو سرکشی کی استطاعت کے باوجود سرزد نہ ہو۔ نیازمندی اسی کی قابلِ ستائش ہے جو خود سراپا ناز ہو۔ اسی سر کے جھکنے میں لذت ہے جس کی پیشانی میں دنیا بھر کی سرفرازیاں جھلک رہی ہوں۔ جس میں انتقام کی قوت نہیں اس کے عفو میں کیا خوبی۔ جس میں ہمسری کی ہمت نہیں اس کا جھک کر سلام کرنا خوئے غلامی ہے۔ جس کے پاؤں تلے حکومت نہیں اس کا بوریہ نشین ہونا گداگری ہے۔ "اختیار رکھتے ہوئے خود پر کنٹرول رکھنا ہی انسانیت کا شرفِ امتیاز ہے۔" اسی سے اس کی خودی میں استحکام پیدا ہوتا ہے اور استحکامِ خودی ہی انسانیت کی معراج ہے۔ اس کا کچھ کچھ ادراک مغربی اقوام کو ہو رہا ہے۔ یہ اقوام قرآنِ پاک پر ایمان تو نہیں رکھتیں۔ تاہم اس میں سے علم و عرفان اور آگہی کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ جتنی بھی ایجادات، انکشافات اور تحقیقات وجود پذیر ہو رہی ہیں، انہی اقوام کی طرف سے بنی نوع انسان کے مصرف کے لئے سامنے آ رہی ہیں۔ مسلمان ہیں کہ علم و عرفان اور آگہی کی کتاب کو چھوڑ کر شخصیتوں کے پھیلائے ہوئے جال میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ "عملی زندگی سے یکسر محروم۔

حالانکہ قرآنِ پاک جو انقلاب دلوں کی بستیوں میں لاتا ہے۔ اس کی رُو سے شخصیت پرستی کی جڑ کٹ کر رہ جاتی ہے۔ قرآنِ پاک کا اعلان ہے کہ "حقِ حکومت خُدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔" اطاعت صرف قانون کی ہوگی کسی انسان کی نہیں۔ مسلمان اس حیاتِ جاوداں کی قندیل کی ابدی روشنی میں قوانینِ خداوندی کی جب تک اتباع کرتا رہا۔ سرفرازیاں اس کے قدموں میں نچھاور ہوتی رہیں۔ حتّٰی کہ یہ دنیا کے ۳/۴ حصے تک پہنچ گیا اور جونہی اس میں جاہ و حشمت اور قوت کا احساس جاگزیں ہوا۔ ملوکیت، پیشوائیت اور سرمایہ کاری کے طبقوں میں منقسم ہو گیا۔ ابدی روشنی کی قندیل کے ساتھ طرح طرح کے فانوسوں کی عارضی اور محدود روشنی کو شامل کرنا شروع کر دیا یعنی جیسے دیسی گھی کے ساتھ ساتھ ڈالڈا متعارف ہوا اور اصلی دیسی گھی آہستہ آہستہ مفقود ہوتا چلا گیا اور ڈالڈا گھی بن گیا۔ ابدی روشنی کی قندیل حریرہ اطلس میں لپیٹ کر سروں سے اونچے مقامات پر محفوظ کر دی گئی۔ شخصیات کی وضع کردہ عارضی اور محدود روشنی کی مدد سے راستے متعین کرنے شروع کر دیئے جس سے شخصیت پرستی نے سر اُبھارنا شروع کیا اور بامِ عروج پر پہنچ گئی۔

تاریخِ انسانیت اس حقیقت پر شاہد ہے کہ قوموں کی کشتی شخصیت پرستی کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے۔ یہ شخصیت پرستی خواہ دنیاوی حکمرانوں کو ظلّ اللہ علی الارض قرار دینے کی شکل ہو، خواہ روحانی پیشواؤں کو فوق البشر حیثیت دینے کی شکل میں۔ شخصیت پرستی کی دوسری شکل پہلی کے مقابلے میں کہیں زیادہ شدید، محکم اور عمیق ہوتی ہے حکمرانوں

...یت کی زنجیریں انسان کے جسم کو مقید کر سکتی ہیں لیکن روحانی پیشوائیت کی محکومیت کا تصور انسان کے قلب و ... ہوتی ہے۔

مسلمان آج دنیا کی کل آبادی کا تیسرا حصہ ہیں اور تقریباً چالیس آزاد و نیم آزاد مملکتوں کا مالک ہونے کے باوجود ... ہو رہے ہیں۔ حالانکہ

یہ مسلمان وہی ہے جس کا ایمان اس خدا پر تھا اور ہے جو رب العالمین ہے۔ اس رسولؐ پر تھا اور ہے جو رحمت للعالمین ہے اس کتاب پر ہے جو ذکر اللعالمین ہے۔ صرف اپنا گریبان ہی دیکھیں تو ـــــ قوم کی ۸۰٪ فیصد آبادی ناخواندہ ہی نہیں بلکہ انسانی بنیادی ضروریاتِ زندگی کو ترس رہی ہے۔ وطنِ عزیز میں اس جہالت اور محرومی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کچھ "ہاتھ" فرقہ پرستی، گروہ بندی اور جرائم کے خوفناک بیج بو کر قوم کو اکائیوں میں تبدیل کرنے میں شب و روز مشغول ہیں اور سب سے بڑھ کر دکھ اور کرب کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے اعلیٰ مرتبت حکمران متعدد ڈگریوں کے حامل، قوم کی تربیت پر مسلط قوم کو ذہنی طور پر مفلوج کر رہے ہیں اور دانستہ یا نادانستہ قوم کو اکائیوں میں تبدیل کرنے والے "ہاتھ" کو نہ صرف تقویت دے رہے ہیں بلکہ مستحکم کرنے کے بھی ذمہ دار بن رہے ہیں۔

اِدھر غیر مسلم ہیں کہ قرآنِ پاک کو جب دل کی گہرائیوں سے پڑھتے ہیں تو جھوم اُٹھتے ہیں۔ اس سے مطابقت رکھتے ہوئے ذیل میں ایک تحریر دی جا رہی ہے۔

نئی دہلی سے شائع ہونے والے ہفتہ وار انگریزی جریدے "ریڈئینس" کی اشاعت ۱۷۔۱۱ دسمبر ۱۹۸۸ء میں ایک مضمون "آج کی دُنیا میں اسلامی تبلیغ اور اس کا طریقہ کار" شائع ہوا تھا۔ مدارس (بھارت) سے تعلق رکھنے والی ایک ہندو خاتون پروفیسر ڈاکٹر بھارتی دیوی نے جب یہ مضمون پڑھا، تو طریقۂ کار پر عمل کرتے ہوئے قرآن کریم کا نسخہ حاصل کر کے پڑھا۔ اس خاتون نے جو نقد و جرح کی، اس مسلم جریدے نے وہ اپنی اشاعت ۱۴۔ ۸ جنوری ۱۹۸۹ء میں پورے متن کے ساتھ پیش کی، اُردو ڈائجسٹ لاہور نے اپنے فروری ۱۹۸۹ء کے شمارہ میں اپنے قارئین کے لئے اس کا اُردو ترجمہ پیش کیا، عنوان ہے "مسلمانوں کو گواہی دینا ہو گی"۔ مضمون کے اختتام پر خاتون لکھتی ہیں کہ میں اپنا خط ان الفاظ پر ختم کرتی ہوں جو میں تو آخری گرامیت کے لحاظ سے کسی بھی طرح کم نہیں اور اس کا حوالہ بھی قرآنِ شریف سے لاتی ہوں۔

"وہ رسولؐ) انہیں ان کے بھاری بوجھ اور (جہالت کی) بیڑیوں سے نجات دلاتا ہے جو انہیں
جکڑے ہوئے ہیں۔ پس وہی لوگ ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اس کی عزت کرتے ہیں
اس کی مدد کرتے ہیں جو اس پر نازل کی گئی ہے" (الاعراف ـــ ۱۵۷)

جو لوگ مظلوم ہیں، ان کے لئے بہتر ہے کہ وہ اس کی پناہ لیں جو انہیں ظلم سے نجات دلائے گا، انہیں زمین کا وارث بنائے گا، انہیں زمین میں استحکام دے گا اور پھر وہ مر کر مٹی میں مل جائیں گے۔ بھارت کے اچھوتوں کے لئے بہتر ہو گا کہ وہ حقیر

جانوروں کی طرح مرنے کی بجائے غیر ہندو بن کر رہیں۔ لیکن انہیں یہ کیسے معلوم ہوگا کہ اس کائنات کا اک ایسا خدا ہے جو ان کی نگہداشت کرتا ہے اور بہت زیادہ پیار کرتا ہے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک ان کی جھونپڑیوں میں جا کر انہیں اس حقیقت سے آگاہ نہیں کرتا۔ ہر مسلمان اس (اسلامی) طرزِ حیات کی گواہی دینے کا پابند ہے کیونکہ خدائے واحد پر اس کے ایمان رکھنے کا مفہوم اور تقاضہ یہی ہے۔

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے دیکھے نہ ہوں گے ہاں مگر ایسے بھی ہیں

علم کو جب تک وحیٔ الٰہی کے ساحلوں میں محدود نہ رکھا جائے تو یہ ایسا پُرشور دریا بن جاتا ہے جس کی طغیانیوں کے آگے عدل، انصاف، اخلاق اور تہذیب و تمدن جڑ سے اُکھڑ کر بہے جاتے ہیں

موت و حیات کا قانون اسی لئے متعین کیا گیا ہے کہ تم میں سے کون ایسے کام کرتا ہے جو اس کے قانون کے مطابق زندگی بخش دیں اور کون ایسا ہے جو اپنے اوپر ہلاکت وارد کر لیتا ہے

ابلیس و آدم صفحہ ۵۵

جنسی اختلاط سے مقصد جائز طریق سے افزائشِ نسل سے ہے۔ محض جنسی تسکین اور لذّت نہیں، جو اختلاط محض حصولِ لذّت کے لئے ہو وہ منشائے فطرت کے خلاف ہے خواہ اسے معاشرہ معیوب سمجھے یا نہ سمجھے

ثریا عندلیب

قرآن کا معاشی نظام

(موجودہ حالات میں عملی نظام)

صدر گرامی و حاضرین کرام السلام علیکم!

جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے امسال طلوعِ اسلام کنونشن کا موضوع 'قرآن کا معاشی نظام' رکھا گیا ہے اور بتانا یہ ہے کہ موجودہ حالات میں اس معاشی نظام کو عملی طور پر کس طرح قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ جہاں تک قرآن کے معاشی نظام کے اصول و ضوابط اور اقدار و قوانین کا تعلق ہے ہم طالب علمانِ قرآنی یقیناً ان سے نابلد نہیں۔ ہم اپنے معلّمِ مشفق مفکرِ قرآن جناب پرویز علیہ الرحمۃ کی بصیرتِ فرقانی کی رہنمائی میں یہ اچھی طرح جان چکے ہیں کہ رب العالمین نے اپنے بندوں کو قرآنی آیات کی صورت میں معیشتِ انسانی کے لئے کونسا متوازن اور حسین نقشہ عطا کیا ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے قرآن کے معاشی نظام پر لمبا چوڑا مقالہ لکھ کر آپ کے سامنے پیش کرنا کچھ مشکل کام نہیں۔ لیکن سوال تو موجودہ حالات میں قرآنی نظامِ معیشت کو معاشرہ میں عملاً نافذ کرنے کا ہے۔ اس سلسلے میں ہم سب پر یہ تلخ ترین حقیقت اچھی طرح واضح ہے کہ آج کم و بیش ساری دنیا میں معیشت کی عمارت سود یعنی ربٰو کی بنیاد پر استوار ہے۔ ربٰو جسے قرآنِ کریم نے سراسر حرام قرار دیا ہے۔ پھر اس سنگینی امر سے کون واقف نہیں کہ دنیا کے وہ چھوٹے ملک اور پسماندہ قومیں جنہیں تیسری دنیا کے نام سے نوازا گیا ہے' اپنی معاشی بدحالی کی وجہ سے دنیا کی بڑی طاقتوں (جنھیں سپر پاورز ہونے کا شرف حاصل ہے) کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتیں بلکہ اپنی طبعی یا حیوانی زندگی کی حفاظت اور پرورش کے لئے ہمہ وقت ان طاقتوں کی مقروض اور ہر قسم کی مدد کی محتاج رہتی ہیں۔ قرض اور مدد کا یہ خود ساختہ معاشی نظام اپنی بقا کے لئے سود ہی کا رہینِ منت ہے اور سود ہی کی بدولت جاری و ساری ہے۔

دنیا کے بیشتر ممالک اور اقوام کو اس انسانی نظامِ معیشت نے اس طرح اپنی گرفت میں جکڑ رکھا ہے کہ وہ اس کے پنجۂ استبداد سے گویا کسی طور آزاد نہیں ہو سکتیں۔ ادھر خود ہم لوگ مسلمان ہوتے ہوئے برعمِ خویش قرآن پر ایمان

رکھتے ہوئے اور دن رات اسے اپنا ضابطۂ حیات پکارتے ہوئے کیا ناقابلِ برداشت معاشی گرداب میں پھنسے ہوئے نہیں؟ جب کہ قرآن نے ہمیں معاشی نظام کا پورا خاکہ دے رکھا ہے مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ دنیا کے موجودہ حالات میں ہماری اجتماعی حالت کسی سے ڈھکی چھپی تو نہیں۔ ہماری محتاجی کا تو یہ عالم ہے کہ آج ہم پاکستانی چار کھرب روپے کے مقروض ہیں اور ہمارا بال بال قرض میں بندھا ہوا ہے۔ مرے کو مارے شاہ مدار۔ اس سے وابستہ سود کی ادائیگی ہمارے اس قرض میں اور پختگی پیدا کرتی ہے۔ یوں اس لعنت سے چھٹکارا ممکن نظر نہیں آتا۔ اس انتہائی بدترین صورت حال کے پیشِ نظر سچ تو یہ ہے کہ ہم دینِ اسلام کے علمبردار قرآن کے معاشی نظام کی عملی شکل پیش کرنے کا اپنا حق بھی کھو بیٹھے ہیں چہ جائیکہ اس کا عملی نفاذ ہم سے ہو۔ آپ ہی بتائیے۔ اس بے عملی یعنی قرآن کے الفاظ میں تجمی کیفیت میں رہتے ہوئے اور ہر آن خود غرضی، مفاد پرستی، دوغلے پن اور بددیانتی سے کام لیتے ہوئے کیا میری یا آپ کی، عوام کی یا لیڈران کی یہ اوقات ہے کہ ہم اس سنگین ترین مسئلہ کا حل کر سکیں؟ پھر اس حقیقت سے کیونکر صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے کہ آج ہم جس دنیا میں بس رہے ہیں اس میں ماضی بعید کی طرح ملک اور معاشرے ایک دوسرے سے نہ کٹے ہوئے ہیں نہ ایک دوسرے سے بے تعلق رہ سکتے ہیں کہ اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ بجا کر اپنا دل خوش رکھنے کا معاملہ ہو۔ یہاں تو صورت یہ ہے کہ کسی کا ہاتھ مستقل طور پر اوپر رہتا ہے تو کسی کا ہاتھ دوسروں کے سامنے مستقلاً پھیلا ہوا۔ زیردست لوگ زبردست قوتوں کی مرضی اور اجازت کے بغیر پتہ توڑنے کی مجال نہیں رکھتے۔ یوں باتیں کرنے اور کہنے کو ہزار مگر جن کا نتیجہ ظاہر ہے لاحاصل اور بیکار۔

بحیثیت امتِ مسلمہ ہمیں اپنی مضبوطی، استحکام، ثبات و استقامت، ہم آہنگی اور یک رنگی اور مخالف قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مادی طاقت کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر ہم قرآنی معاشی نظام دنیا کے سامنے تو کیا پیش کریں گے اپنے ہاں بھی رائج کرنے کے مجاز نہیں۔ ہاں مگر ایک راستہ ہے جس سے ہماری اصلاح ممکن نظر آتی ہے اور ہم قرآنی معاشی نظام کی طرف قدم بڑھا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں ان باطل تصورات و مفروضات کو جو ہمارے ذہن زنگ آلود کئے ہوئے ہیں کلیتاً مٹا کر اپنے اذہان و قلوب کو سورج کی روشنی کی طرح پاک صاف کرنا ہوگا کہ ذہنیت کی تطہیر کے بغیر نہ کوئی صحیح عمل اپنایا جا سکتا ہے نہ معاشرہ متوازن طور پر تعمیر پاتا ہے۔

معیشت کے تعلق سے ہمارے مروجہ نظام میں ملکیت کا غیر قرآنی تصور جس طرح ہمارے معاشرہ کے لئے ناسور کی حیثیت اختیار کر چکا ہے وہ قرآنی تعلیم کا ادراک رکھنے والے ارباب دانش و بینش سے مخفی نہیں اور یقین جانئے کہ ملکیت کا تصور ہی قرآن کے معاشی نظام کے قیام کے راستے کی وہ آہنی دیوار ہے جس کو بہر صورت توڑ ڈالنا ہماری سب سے پہلی اور بنیادی ذمہ داری ہے کہ یہی غلط تصور ان مفروضات کو جنم دیتا ہے جو مروجہ شیطانی نظام کی

تقویت کا باعث بنتے ہیں۔

آپ عزیز بہن بھائی قرآن سے وابستگی رکھنے والوں کو بخوبی علم ہے کہ قرآن کریم کی رو سے ملکیت اللہ کی ہے۔ ہم اللہ کے بندے اشیائے کائنات سے فائدہ تو حاصل کر سکتے ہیں ان کے مالک نہیں بن سکتے۔ اگر زمین جس میں تمام انسانوں کے لئے معیشت کا سامان موجود ہے کو سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ نہ رکھا جائے تو قرآن کے نزدیک یہ کفر بھی ہے اور شرک بھی (حوالہ ۱۰-۹/۴۱)۔ زمین کی ملکیت کے اس تصور سے ہی دوسری تمام چیزوں کی ملکیت در آتی ہے۔ مال و دولت کی ملکیت، مکانوں، دکانوں کی ملکیت، کارخانوں فیکٹریوں کی ملکیت یہ بھی میری پونجی، وہ بھی میرا اثاثہ، جو چھوٹی بڑی چیز جس جس طرح بھی حاصل ہو جائے، بندہ اس کا آقا اور مالک بن بیٹھتا ہے۔ شیرِ مادر کی طرح ہر چیز اس کے لئے حلال اور جائز قرار پاتی ہے۔ اس اساس پر جس قسم کا نظامِ معیشت قائم ہوتا ہے وہ ہم اپنے معاشرہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ تصورِ ملکیت کی اس ربوبیت سوز فضا میں ہمارا یہ مطالبہ کہ یہاں قرآن کے معاشی نظام کو عملاً نافذ کیا جائے کیا یہ خود فریبی نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ملکیت کی چادر لپیٹ کر ہمارے قدم کبھی صحیح سمت نہیں اُٹھ سکتے، نہ ہی قرآن کا انسانیت ساز معاشی نظام قائم ہو سکتا ہے۔ یہ قرآن نازل کرنے والے اللہ کا فیصلہ ہے میرا آپ کا فتویٰ نہیں۔ اگر ہم اس باب میں واقعی سنجیدہ ہیں اور حقیقتاً یہ چاہتے ہیں کہ قرآن کے معاشی نظام کو عملاً نافذ کرنے کی طرف کچھ پیش رفت ہو تو ہمیں ملکیت سے ملوث اپنی سوچ کو یکسر ختم کرنا ہوگا کہ یہ قرآنی فکر سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ قل العفو کے قرآنی اصول کو دیکھئے کس طرح تصورِ ملکیت پر خطِ تنسیخ کھینچ ڈالا ہے۔ اس نظامِ معیشت میں بات تو دینے کی ہے لینے کی نہیں۔ اپنی ضروریات سے زائد ہر چیز دوسرے ضرورت مندوں کو دے دینا ہے۔

اس حوالے سے آپ کے سامنے ضرور یہ حدیث مبارکہ بھی آئی ہوگی جو مشکوٰۃ میں درج ہے۔ حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھے۔ ایک شخص آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جس کے پاس سواری ضرورت سے زائد ہو وہ اس آدمی کو دے دے جسے اس کی ضرورت ہو۔ جس کے پاس زادِ راہ زیادہ ہو وہ اُسے دے دے جس کے پاس زادِ راہ نہ ہو۔ اسی طرح آپؐ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمایا۔ حتیٰ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم سے کسی کو بھی ضرورت سے زائد کوئی چیز رکھنے کا حق نہیں۔ تو عزیز بہن بھائیو! قرآن کا معاشی نظام تو اسی طریقے سے تشکیل پاتا ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے سمجھا دیا ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ ہم اس راستے پر چلنے کو تیار ہیں جو ہر قدم پر قربانی و ایثار چاہتا ہے! اس طریقہ کار کو اختیار کرنے پر آمادہ ہیں جس سے صرف ہماری ہی ضرورتیں پوری نہ ہوں دوسروں کی ضرورتیں بھی رُکی نہ رہ جائیں۔ اگر ہمارا یہ مؤقف نہیں اور ہم اس پر عمل پیرا نہیں رہتے تو پھر قرآن کے معاشی نظام کی بات کرنا ہمیں زیب نہیں دیتا۔ یاد رکھئے! تغیرِ نفس کی انقلابی راہ اختیار کئے بغیر نہ ہماری معیشت درست ہو سکتی نہ معاشرت۔ آیئے مل کر اس قرآنی راستے کی طرف قدم بڑھائیں۔

ڈاکٹر شیخ شاہد خورشید
سالِ نجم علامہ اقبال میڈیکل کالج لاہور

اِک ولولۂ تازہ دیا مَیں نے دِلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

جناب صدر:

اُمّتِ مسلمہ کے عظیم فلسفی اور صاحبِ بصیرت شاعر علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں بہت پہلے اس بات کی نشاندہی کر دی تھی کہ مستقبل میں لاہور سے لے کر بخارا و سمرقند تک ایک جغرافیائی پٹی بنے گی اور اسلام کے احیاء اور نشاۃِ ثانیہ کا کام لاہور یعنی جنوبی ایشیا سے شروع ہوگا اور وسطی ایشیا تک ایک مسلم بلاک بنے گا۔

آج کے حالات نے ان کے شعر کی حقیقت کو عیاں کر دیا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آج سے ۷۵ برس قبل جب روس میں ۱۹۱۷ء میں سُرخ انقلاب برپا ہوا تو لینن نے زار شاہی کے سامراج کو سوشلسٹ سامراج میں تبدیل کر دیا۔ سٹالن نے دوسری جنگ عظیم سے فائدہ اٹھا کر اس سامراج کو مشرقی یورپ کے ملکوں پر بھی مسلّط کر دیا۔ تمام مذاہب عبادات کے نظام اور عقائد پر پابندی لگا دی گئی۔ مگر یاد رکھیں کہ ہر فرعون کے گھر میں ایک موسٰی پیدا ہوتا ہے۔ کمیونزم نے کچھ اپنی نظریاتی سپرٹ کے ذریعے اور کچھ جبر کی حکومت کے ذریعے قوم پرستوں کو دبا رکھا تھا مگر مرکز کا دھڑن تختہ ہوتے ہی جس طرح مغل شہنشاہیت میں صوبے آزاد ہو گئے تھے ایسے ہی سوویت یونین کی ریاستوں نے بھی آزادی کے نعرے لگائے اور خاص بات یہ ہے کہ آزادی کے سوال پر ریفرنڈم کرانے اور پارلیمنٹ سے آزادی کی توثیق حاصل کرنے والے رہنما وہی تھے جو ماضی میں پکے کمیونسٹ رہے ہیں اور جابرانہ طریقوں سے حکومت بھی کرتے رہے ہیں۔ یوں

سوشلزم کے گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

روسی ریاستوں کی آزادی کے بعد اب فلسفہ اور اقتصادی، سیاسی، فوجی اور عمومی زندگی کا ایک نیا مرحلہ اور سوچ سامنے آئے گی۔ ایک نئے اقتصادی بلاک کی امید نظر آ رہی ہے۔ اگر یہ بلاک مضبوط اور منظم شکل میں سامنے آ گیا تو اس

سے نہ صرف اسلامی ممالک کے وجود کو اہمیت حاصل ہو گی بلکہ اقتصادی سطح پر بھی یہ ممالک اہم کردار ادا کریں گے اور منظم انداز سے ترقی کی راہ پر گامزن ہوں گے۔ اس اقتصادی بلاک کے زمرے میں کافی پیش رفت بھی ہو چکی ہے۔

۱۹۸۵ء میں پاکستان، ایران اور ترکی پر مشتمل اقتصادی تعاون کی ایک تنظیم ایکو وجود میں آئی تھی۔ اب روسی ریاستوں کی آزادی کے بعد اس تنظیم میں

۱۔ آذربائیجان
۲۔ ترکمانستان
۳۔ ازبکستان
۴۔ تاجکستان بھی شامل ہو چکی ہے۔ جب کہ قازقستان اور کوغیزستان کو ایکو (E.C.O) میں مبصروں کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ریاستیں معاشی اعتبار سے بہت پیچھے ہیں لیکن بے پناہ قدرتی وسائل کی آماجگاہ ہیں جن کو بروئے کار لانے کے لئے جاپان کے تعاون سے صنعتیں لگانی پڑیں گی۔ یاد رہے کہ قازقستان وسط ایشیا کی سب سے بڑی ایٹمی طاقت ہے جس کے صدر نور سلطان نذربایوف نے ۲۵ فروری ۱۹۹۲ء کو پاکستان کا دورہ بھی کیا ہے۔ اگر مسئلہ افغانستان حل ہو جائے اور افغانستان ایکو میں شامل ہو جائے تو امریکہ کے مقابلے میں مسلم ممالک کی ایک نئی ایٹمی سپر پاور آجائے گی۔ جس سے امریکہ بہادر کی جہانگیری خطرے میں پڑ جائے گی اور اسے دُنیا کے سیاسی اور معاشی معاملات میں تن تنہا من مانی کی اجازت نہیں ہو گی۔ امریکہ کو اپنے نیو ورلڈ آرڈر کے مقابلے میں مسلم ورلڈ آرڈر ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔

حکومتِ پاکستان وسطی ایشیا کے ساتھ تجارت کو ممکن بنانے کے لئے دو زمینی راستوں

۱۔ کابل طورخم روڈ
۲۔ شاہراہِ ریشم

کے علاوہ سمندری اور ہوائی رابطے بھی قائم کر رہی ہے۔ اس مقصد کے لئے گوادر کی بندرگاہ کو جدید تقاضوں کے عین مطابق بنانے کے لئے منصوبہ زیرِ غور ہے۔ اسلام آباد سے تاشقند تک ہوائی سفر بھی شروع ہو چکا ہے۔ وسطی ایشیا میں پاکستانی بینک قائم کرنے کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ وسطی ایشیا سے پاکستان کو نہ صرف سستے داموں بجلی مل سکتی ہے بلکہ وسط ایشیا پاکستانی برآمدات کے لئے ایک بہت بڑی منڈی بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ وسطی روس میں چھ مسلمان ریاستیں ہیں جہاں اب اسلام کی خدمت کی راہیں کھل جائیں گی اور مسلم ممالک ۴۶ سے بڑھ کر ۵۲ ہو جائیں گے اور امریکہ کی اتنی ہی ریاستیں ہیں۔ امریکی سینیٹر لیری پریسلر کو خطرہ ہے کہ اس طرح وسط ایشیائی ریاستیں پاکستان کے راستے اپنی مصنوعات برآمد کر سکیں گی اور ان ریاستوں میں اسلام کو فروغ حاصل ہو گا۔ اس لئے اس نے زور دیا ہے کہ پاکستان ایٹمی پی ٹی بی پر دستخط کرے۔

امریکہ نے عراق کے ساتھ جنگ کے دوران نیو ورلڈ آرڈر کا نعرہ لگایا جس کا مطلب ہے کہ پوری دنیا مغربی سرمایہ دارانہ جمہوریت کے زیرِ اثر آجائے۔ نیز یہ کہ مغرب کا تہذیبی، فوجی اور اقتصادی و مالی غلبہ برقرار رہے بلکہ مزید بڑھے۔ اس کے برعکس مسلم ورلڈ آرڈر یہ ہے کہ مغربی سرمایہ دارانہ جمہوریت، مغربی تہذیب اور مغربی ٹیکنالوجی کی برتری کو محدود یا ختم کر کے عالمِ اسلام (اور خود دنیا) کو مغرب کے غلبے سے محفوظ کیا جائے۔ اسلام کے تہذیبی نظریات کو عالمِ اسلام اور پوری دنیا میں غلبہ و برتری حاصل ہو۔ مسلم ممالک میں فکری انتشار اور عملی گمراہی کے پہلو بہ پہلو عالمِ اسلام کی راکھ کے اندر بعض چنگاریاں بھی ہیں جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شعلۂ جوالہ بن سکتی ہیں۔ مغرب اس امکان سے خوفزدہ ہے۔ سابق امریکی صدر نکسن نے بلاوجہ سوویت یونین اور مغرب سے یہ نہیں کہا تھا کہ "وہ پُرامن بقائے باہم کا راستہ اپنائیں اور ابھرتے ہوئے اسلامی خطرے کا مل کر مقابلہ کریں"۔

دنیا دیکھ رہی ہے کہ اسلامی ورلڈ آرڈر کا ادراک اور شعور آہستہ آہستہ بہت آہستہ آہستہ لیکن مسلسل اب عام ہو رہا ہے۔ اس کو انگریزی محاورے کے مطابق "LIGHT AT THE END OF TUNNEL" یعنی تاریک سرنگ کے آخری سرے پر روشنی کی کرن کہا جاسکتا ہے اور اس کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اب ایک طرف امریکہ کی سپر پاور ہے اور دوسری طرف اللہ کی سپریم پاور ہے۔ ایک طرف امریکہ کا ورلڈ آرڈر ہے تو دوسری طرف اللہ کا سپریم آرڈر ہے۔ ایک طرف امریکہ کی SUPERIORITY ہے، دوسری طرف اللہ کی SOVEREIGNITY ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جیت کس کی ہوتی ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ جیت اسلام اور خدا تعالیٰ کی ہوگی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

کئی سال پہلے علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ مجھے لگتا ہے کہ اسلام کو اپنے دفاع کی جنگ پنجاب میں لڑنی پڑے گی۔ اور واقعی آپ دیکھیں کہ پاکستان نے افغانستان سے روسیوں کو بھگانے کے لئے ہر سطح پر کوشش کی ہے اور مرحوم صدر ضیاء الحق نے کہا تھا کہ ہم پاکستان کے دفاع کی لڑائی افغانستان سے لڑ رہے ہیں۔

لوگ روس کو ناقابلِ تسخیر سمجھتے تھے لیکن چشمِ فلک نے دیکھا ہے کہ روسیوں نے خود ہی اپنے قومی ترانے سے ناقابلِ تسخیر کے الفاظ حذف کر دیئے ہیں۔ صدیوں کی تبدیلیاں آج سالوں میں ہو رہی ہیں۔ سلطنتِ روم اور سلطنتِ مغلیہ کے زوال کو صدیاں لگیں لیکن روس کے زوال کو چند ماہ لگے۔ اب امریکہ بہادر اپنی خیر منائیے۔ کیونکہ مسلمانوں میں جوش اور خود انحصاری کا جذبہ پیدا ہوگیا ہے۔ مسلم ممالک میں امریکہ کا حال یہ ہے کہ

حویلی میاں باقر دی   تے وچ جما لو آکڑ دی

لیکن یاد رکھیں کہ سرزمینِ اسلام نے اگر طارق بن زیاد، سلطان ٹیپو اور حضرت امام بخاری جیسے فرزند پیدا کئے ہیں تو صدام حسین جیسے شیر بھی پیدا کئے ہیں جنھوں نے امریکہ اور اس کے نام نہاد نیو ورلڈ آرڈر سے کھُل کر ٹکر لی ہے۔ دنیا یکھے گی کہ کبھی امریکہ کے بھی ٹکڑے ہوں گے اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی جو لہر لاہور سے چل کر بخارا اور سمرقند تک گئی ہے وہ امریکہ راس کے ورلڈ آرڈر کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گی اور امریکہ کا انجام ہٹلر جیسا ہوگا۔

ع اور بھی دُور فلک ہیں ابھی آنے والے

نازا اتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے

ب حالات کا تقاضا ہے کہ مسلمان وقت کی نبض کو پہچانیں اور متحد ہو جائیں امریکہ کی SUPERIORITY کی بجائے اللہ تعالیٰ کی SOVEREIGNITY کا بول بالا ہو۔

زمین لالہ پہ روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جستجو کر دے

صرف علم سے ذہنی بصیرت تو حاصل ہو سکتی ہے قلبی ایقان نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے تنہا علم کوئی انقلاب پیدا کر سکتا ہے نہ ہی حقیقت کی گہرائیوں تک پہنچ سکتا ہے

صرف اچھے قانون کا ہونا کافی نہیں اس قانون کے پیچھے قوّتِ نافذہ کا ہونا بھی از بس ضروری ہے

بابُ المراسلات

محترم ایڈیٹر صاحب ماہنامہ طلوعِ اسلام، السّلام علیکم

طلوعِ اسلام، کی اشاعت اپریل ۹۲ء میں میرا ایک خط بنام عزت مآب جسٹس تنزیل الرحمٰن چیف جسٹس شریعت کورٹ آف پاکستان، شائع ہوا تھا۔ اس کے جواب میں ریسرچ ایڈوائزر صاحب کی طرف سے جواب موصول ہوا جس کی نقل لف ہذا ہے، اس خط میں SECTION 8 THE OFFENCE OF ZINA کا حوالہ دیا گیا ہے، یہ تاحال دستیاب نہیں ہو سکا۔ چنانچہ اس سلسلے میں سرِدست مزید تبصرہ لاحاصل ہوگا۔ اس سلسلے میں قارئین طلوعِ اسلام کے خطوط بھی موصول ہوئے ہیں۔ ایک خط کی فوٹو کاپی آپ نے ارسال فرمائی تھی جو کہ مسٹر بشیر احمد صاحب کی طرف سے آپ کے نام ہے۔ اس خط میں محترم بشیر احمد صاحب نے مجھے اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالنے کے لئے کہا ہے۔ خاص طور پر سورۂ نور کی ابتدائی آیات کو مدِنظر رکھتے ہوئے۔ اس ضمن میں مفسرین بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ بہرحال میں بشیر احمد صاحب کی فرمائش پوری کرنے کی غرض سے مندرجہ ذیل سطور پیش کرتا ہوں۔

سب سے پہلے حدود آرڈی نینس کے الفاظ کو پھر ایک مرتبہ سامنے رکھئے جس کی خاطر میں نے عزت مآب جج صاحب کی خدمت میں خط لکھا تھا۔

"(ا) ملزم ایک بااختیار عدالت کے سامنے اپنے جرم کا اقرار کرے یا (ب) کم از کم چار ایسے گواہ جو بالغ مرد ہوں اور جن کے متعلق عدالت مطمئن ہو کہ وہ تزکیۃ الشہود کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں اور جو سچے لوگ ہوں اور کبیرہ گناہوں سے بچے ہوئے ہوں شہادت دیں کہ انہوں نے دخول کے عمل کو جو کہ جرم کے لئے ضروری ہے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو....."

اس ضمن میں، مَیں نے یہ مؤقف پیش کیا تھا کہ ایسے چار گواہ پیش کرنا ناممکن ہے جنہوں نے دخول کے عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اور نہ اس چشم دید گواہی کا ذکر قرآن کریم میں کہیں موجود ہے۔ البتہ زنا کے ثبوت میں دیگر قسم کی شہادات مثلاً میڈیکل شہادات یا کوئی ایسی شہادت کہ نامحرم جوڑے کو کسی گوشۂ خلوت کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا یا بغل گیر ہوتے دیکھا تھا

وغیرہ وغیرہ پیش کی جاسکتی ہیں۔ میں نے جناب جسٹس صاحب کی خدمت میں اپنا خط اس غرض سے بھیجا تھا تاکہ معلوم ہوسکے کہ جب سے یہ قانون نافذ ہوا ہے اس وقت سے لے کر آج تک دخول کے کتنے چشم دید گواہ عدالتوں میں پیش ہوئے ہیں۔ میں نے اپنے خط میں متعلقہ آیات (۲۴:۲) اور (۴:۱۵) پیش کی تھیں۔ اب آیئے دیگر آیات کی طرف جو سورۂ نور میں ہیں۔ (مندرجہ ذیل سطور میں میں نے علامہ غلام احمد پرویز مرحوم کے مفہوم پر انحصار کیا ہے۔ (۲۴:۳) اس آیت کا ترجمہ محترم سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے یوں کیا ہے:

"زانی نکاح نہ کرے مگر زانیہ کے ساتھ اور زانیہ نکاح نہ کرے مگر زانی یا مشرک کے ساتھ اور یہ حرام کر دیا گیا ہے اہلِ ایمان پر"

اسی قسم کا ترجمہ دیگر مفسرین نے بھی کیا ہے لیکن یہ عملی طور پر مشکل نظر آتا ہے کہ کوئی زانی نکاح کے لئے کسی زانیہ کی تلاش کرتا پھرے یا زانیہ کسی اخبار میں اشتہار دے کہ ایک زانی کی ضرورت ہے۔ پھر زنا کے بے شمار ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ کبھی کسی تیسرے شخص کے نوٹس میں نہیں آتے۔ البتہ دخول کے عمل کی چشم دید گواہی کے علاوہ دیگر شہادات کی بنا پر ثابت شدہ زنا کے CASES پر یہ پابندی لگائی جاسکتی ہے کہ کسی مومن کے ساتھ شادی نہ کریں اور اگر کر بیٹھیں تو اُسے جرم قرار دیا جائے۔ گو ایسے کیس بھی شاید ہی کبھی سامنے آئے ہوں۔ اس آیت (۲۴:۳) پر غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ نفسیات کا معاملہ ہے۔ پہلے تو یہ دیکھئے کہ نکاح کا لفظ لغت میں جنسی تعلقات کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ نکاح کا لفظ عقد کے لئے آتا ہے جماع کے لئے اس کا استعمال بطور استعارہ ہوتا ہے چنانچہ آیت (۲۴:۳) میں يَنْكِحُ سے مراد جنسی تعلق قائم کرنا ہے نہ کہ اصطلاحی نکاح۔ اس قسم کے جنسی تعلق کے لئے وہی عورت راغب ہوگی جو حفاظتِ عصمت کو مستقل قدر نہ سمجھے یا سرے سے (اللہ کی جگہ) اپنی خواہشات کو معبود بنالے کہ ان کے ہر تقاضے کے سامنے جھک جائے۔ (بحوالہ ۳۳:۴۵) اس طرح اس قسم کے تعلقات پر وہی مرد آمادہ ہوگا جو اپنی خواہشات کا غلام ہو اور انسانی اور حیوانی زندگی میں تمیز نہ کرے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زنا اسی صورت میں سرزد ہوتا ہے کہ مرد اور عورت دونوں ہم خیال ہوں (البتہ زنا بالجبر کی صورت مختلف ہے اس میں عورت مجرم قرار نہیں پاسکتی) گران میں سے ایک بھی پاک باز ہو تو زنا کا امکان نہیں ہوسکتا۔ (اسی لئے زنا کی سزا مرد اور عورت دونوں کے لئے ہے) مومنین کے لئے اس قسم کے تعلقات حرام ہیں۔

——— (۲۴:۴)۔ جب عصمت اس قدر گراں بہا اور مستقل قدر ہے تو اس کی حفاظت کے لئے بھی پختہ تدابیر کرنی چاہئیں۔ اس سلسلہ میں حکم یہ دیا جاتا ہے کہ جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور اپنے دعوے کے ثبوت میں چار گواہ نہ لائیں تو انہیں اسی کوڑے لگاؤ اور اس کے بعد ایسے ساقط الاعتبار لوگوں کی جو دوسروں کے خلاف بے بنیاد الزام لگائیں گواہی قبول نہ کرو اور انہیں ان حقوق سے بھی محروم کر دو جو اسلامی مملکت کے شریف انسانوں کو حاصل ہوتے

ہیں اور اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئیں تو انہیں اس سے بھی زیادہ سخت سزا دو۔ اس لئے کہ یہ لوگ صحیح راہ چھوڑ کر دوسری طرف نکل جاتے ہی ان کو حقوقِ شہریت سے محروم کر دینا چاہیئے اور آخرت کی سزا اس کے علاوہ ہے۔

یہ آیت عورتوں پر تہمت لگانے کے متعلق ہے۔ زنا کے عام واقعات کی نسبت سے تہمت کے CASES کی نوعیت مختلف ہے۔ زنا کا ہر کیس تہمت نہیں ہوتا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ زنا مرد اور عورت کی باہمی رضامندی سے سرزد ہوتا ہے۔ تہمت میں عورت کی مرضی غیر متعلق ہے۔ اس آیت میں تہمت کو ثابت کرنے کے لئے چار گواہوں کا ذکر ہے۔ لیکن ان چار گواہوں کی گواہی بھی CIRCUMSTANTIAL EVIDENCE ہوگی۔ دخول کے چشم دید گواہوں کا یہاں بھی نہ کوئی ذکر ہے نہ کوئی تعلق ہے۔ جب دخول کے چار چشم دید گواہ ممکن ہی نہیں تو ان کا ذکر کیسے ہو۔

(۲۴ : ۵) ہاں اگر یہ لوگ اپنی غلط روش یعنی SCANDEL پھیلانے سے باز آجائیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو پھر انہیں معاف کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ قانونِ خداوندی میں عفو اور درگذر کی گنجائش رکھ دی گئی ہے۔ معاشرے میں سکینڈل سے بے پناہ برائیاں پھیلتی ہیں، عموماً لوگ اس میں دلچسپی لے کر بات کا بتنگڑ بناتے چلے جاتے ہیں اور اس سے ایک قابلِ نفرت ماحول معرضِ وجود میں آتا ہے، قرآنِ کریم اس گندگی کی نشر و اشاعت کے آگے بند لگانا چاہتا ہے۔

(۲۴ : ۶ — ۹)

وہ لوگ جو خود اپنی بیویوں کے خلاف تہمت لگائیں اور ان کے پاس سوائے اپنے آپ کے اور کوئی گواہ نہ ہو تو ایسے معاملے میں یوں فیصلہ کیا جائے کہ مرد چار بار اللہ کو حاضر ناظر جان کر گواہی دے کہ وہ سچ کہتا ہے اور پانچویں بار کہے کہ اگر میں نے جھوٹ بولا ہو تو مجھ پر خدا کی لعنت ہو (یعنی میں ان تمام حقوق و مفادات سے محروم ہو جاؤں جو مجھے اسلامی حکومت کے شہری ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں۔ اس سے وہ عورت مجرم قرار پا جائے گی لیکن اگر وہ بھی اپنی مدافعت میں اسی طرح خدا کو حاضر ناظر جان کر گواہی دے کہ وہ مرد جھوٹ بولتا ہے اور پانچویں دفعہ یہ کہے کہ اگر وہ سچا ہے تو مجھ پر خدا کا غضب ہو (یعنی مجھے حلفِ دروغ گوئی کی سزا ملے) تو وہ اس سے بری الذمہ ہو جائے گی۔

دیکھئے قرآنِ کریم کس طرح ان تہمتوں کے بداثرات کو زائل کرتا چلا جاتا ہے۔ ان آیات (۹ - ۶ : ۲۴) میں جو کہ خود اپنی بیویوں کے خلاف تہمت کے متعلق ہیں اپنے سوا کسی دوسرے شخص کی شہادت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

"ولم یکن لھم شھداء الا انفسھم"

(۲۴ : ۱۰)

اے جماعتِ مومنین! یہ اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہے کہ اس نے اپنے قانون میں اس طرح عفو، درگذر اور نرمی کی گنجائش رکھ دی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اپنی خطا اور لغزش کے احساس کے بعد اپنی غلط روش کو

چھوڑ کر قانونِ خداوندی کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ قانون اپنی تمام مراعات کو لئے اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ اس کی طرف رُخ کرتا ہے اور یہ چیز عین حکمت کے مطابق ہے۔ قانون سے مقصد فرد کی اصلاح اور معاشرہ کی سلامتی ہے اگر یہ مقصد عفو اور درگذر سے حاصل ہو سکتا ہے تو سزا کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

(۲۴ : ۱۱)

ان احکام کی روشنی میں اس واقع پر غور کرو جو تمہارے ہاں ہوا ہے۔ اس میں بعض لوگ جو تمہاری اپنی جماعت کے تھے خود اپنی جماعت کے دوسرے لوگوں کے خلاف (۲۴ : ۱۲) جھوٹی تہمت تراش لائے تھے (انہوں نے اپنی طرف سے تو چاہا تھا کہ اس سے معاشرہ میں سخت خرابی پیدا ہو جائے گی لیکن تم ایسا خیال نہ کرو کہ اس سے واقعی کوئی خرابی پیدا ہوئی ہے) بلکہ یہ تو تمہارے لئے اچھا ہی ہوا (کہ ایک ٹھوس مقدمہ سامنے آ گیا جس کا فیصلہ ان قوانین کی رُو سے ہو گیا اور ہر ایک کو معلوم ہو گیا کہ اس قسم کے واقعات میں افرادِ معاشرہ کو کیا کرنا چاہیئے)۔ اب ان مجرمین میں سے ہر ایک کو اپنے کئے کی سزا ملے گی اور جو اس شرارت کا بانی مبانی ہے وہ اوروں سے بھی زیادہ سخت سزا کا موجب ہو گا۔

قرآنِ کریم بنی نوعِ انسان کے لئے ہدایت کا منبع ہے اور اس طرح اصول بیان کرتا چلا جاتا ہے تاکہ پرسکون معاشرے کا قیام عمل میں لایا جا سکے۔ بعض مفسرین نے حسبِ عادت "واقع افک" کے عنوان سے حضرت عائشہؓ کا قصہ مرچ مصالحہ لگا کر بیان کیا ہے جن لوگوں کو شوق ہو وہ ان مفسرین کی تفسیریں پڑھ کر اپنا شوق پورا کر لیں۔

(۲۴ : ۱۲)

لیکن اس میں جہاں وہ لوگ قابلِ مواخذہ ہیں جنھوں نے یہ جھوٹی تہمت تراشی اور اس کی اس طرح تشہیر کی، وہاں تمہارے معاشرہ کے دوسرے افراد بھی بری الذمہ قرار نہیں پا سکتے، ان افراد سے پوچھو کہ جب تم نے اس بات کو سُنا تھا تو تم نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کا سا طرزِ عمل کیوں نہ اختیار کیا اور اپنے لوگوں کے متعلق (جن کے خلاف یہ بات کہی جا رہی تھی) حسنِ ظن سے کام کیوں نہ لیا۔ اس بات کے سننے پر تمہارا پہلا ردِ عمل یہ ہونا چاہیئے تھا کہ ان لوگوں سے کہہ دیتے کہ یہ تو اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ۝ صریح تہمت نظر آتی ہے (جب تک تحقیق کے بعد بات ثابت نہ ہو جائے، اس وقت تک عام معاشرہ کا ردِ عمل یہی ہونا چاہیئے کہ وہ ملزم کو بے گناہ سمجھے۔ ملزم کو مجرم قرار دینا عدالت کا کام ہے نہ کہ عام افراد کا۔ جب تم کسی کے خلاف کوئی بات سُنکر صحیح تسلیم کر لیتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس شخص کو مجرم قرار دے دیتے ہو)۔

(۲۴ : ۱۳)

اگلی بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ الزام لگایا تھا ان پر یہ واجب تھا کہ وہ اس الزام کے ثبوت میں چار گواہ

پیش کرتے (۴ : ۲۴) سو جب یہ لوگ گواہ نہیں لاسکے تو عدالتِ خداوندی کے نزدیک یہ جھوٹے ہیں۔

۲۴ : ۱۴

یہ تو اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تھی (کہ بات زیادہ نہ بڑھی اور معاملہ سنبھل گیا۔ ورنہ) ورنہ جس انداز سے تم اس فتنہ میں بہہ گئے تھے، تم پر حال ہی میں تباہی آجاتی اور اس کے اثرات اس قدر دُور رس تھے کہ تم مستقبل میں بھی تباہ و برباد ہو جاتے۔ (اس لئے کہ ہو سکتا تھا کہ اس سے تمہارے معاشرہ میں اس قدر خلفشار پھیل جاتا کہ خانہ جنگی شروع ہو جاتی جس سے تمہیں فوری نقصان بھی پہنچتا اور اس کی آگ دُور دُور تک پھیل جاتی اور اس تباہی کا سلسلہ تمہاری موجودہ زندگی تک ہی محدود نہ رہتا تمہاری اُخروی زندگی بھی تباہ ہو جاتی۔ اس لئے کہ مومنین کا ایک دوسرے کو بالارادہ قتل کر دینا عذابِ جہنم کا مستوجب ہوگا۔ (بحوالہ ۴ : ۹۳)

(۲۴ : ۱۵)

حقیقت یہ ہے کہ تم نے اس معاملہ کی اہمیت کا احساس ہی نہیں کیا۔ اُسے یوں ہی معمولی بات سمجھتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تم نے اس بات کو سنتے ہی زبانوں پر چڑھا لیا اور اسے بلا تحقیق و تفتیش آگے دہراتے چلے گئے۔ (قرآن کریم کا حکم ہے کہ جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو کہ کان اور آنکھ اور ذہن ان سب سے باز پرس ہوگی (۱۷ : ۳۶) تم نے اُسے معمولی بات سمجھ لیا حالانکہ قانونِ خداوندی کی رُو سے یہ بات بڑی اہم تھی۔

(۲۴ : ۱۶)

جب تم نے اُسے سُنا تھا تو تمہیں یہ کہنا چاہیئے تھا کہ ہمارے لئے مناسب نہیں کہ ہم اس کے متعلق کوئی بات کریں۔ یوں تو معصوم خدا کی ذات ہے لیکن یہ تہمت بڑی سنگین نظر آتی ہے۔

(۲۴ : ۱۷)

بہرحال یہ واقع تو گزر گیا لیکن اللہ تمہیں اس کی بابت اس شدت سے اس لئے فہمائش کر رہا ہے کہ اگر تم اس کی بات ماننے والے ہو تو اس قسم کی حرکت دوبارہ نہ کرنا۔

(۲۴ : ۱۸)

یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے اس نے تہمت تراشی سے جرم کے متعلق قانون کو اس وضاحت سے بیان کر دیا ہے اللہ تمام امور کا علم رکھتا ہے اور اس کی ہر بات حکمت پر مبنی ہے۔

(۲۴ : ۱۹)

یاد رکھو! جو لوگ چاہتے ہیں کہ جماعتِ مومنین کے اندر اس قسم کی بے حیائی کی باتیں پھیلائیں۔ انہیں اس زندگی میں بھی (ازروئے قانون) سخت سزا ملے گی اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ اس قسم کی

باتیں کس قدر تباہی کا موجب ہوتی ہیں اور تم اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

(۲۰ : ۲۴)

حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ اوپر (۱۴ : ۲۴) میں کہا گیا ہے کہ اگر خدا کا فضل و رحمت تمہارے شاملِ حال نہ ہوتے تو تم اس وقت سخت خطرے میں پڑ چکے ہوتے۔ وہ ان معاملات کے متعلق صحیح راہ نمائی اس لئے دیتا ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ انسان یونہی بے خبری اور لاعلمی سے تباہ ہو جائے۔ وہ انسانوں کی حفاظت چاہتا ہے تباہی نہیں چاہتا۔

عبدالودود
۴ مئی ۱۹۹۲ء

۲۔ ادارہ سے متعلق تمام مخلصینِ اسلام (قرآن) السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

اللہ آپ سب کی کوششوں اور اخلاص میں وہ نور بھر دے کہ تاریکیوں اور جہالت کے غبار میں گم انسانیت کا قافلہ فرعون، ہامان اور قارون کی نظر فریب طلسمی طوق کو اتار پھینک کر جبر و استبداد کے نیل کے اس پار اُتر جائے۔ آمین۔ آنکھ بند کرتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ آپ لوگ فرعون کے دربار میں فرعون کے جادوگروں سے برسرِ پیکار ہیں اور یہ یقین باعثِ طمانیتِ قلب ہے کہ جو عصا (قرآن) اور یدِ بیضاء (بصیرتِ قرآنی) لے کر آپ میدان میں اُترے ہیں وہ چودہ سو سالہ سیوتوں (نظر فریب رسیوں) کو ایک ایک کر کے نگل لے گا۔ اور وہ دن دُور نہیں جب یہ درباری وظیفہ خور جادوگر صداقت کو بچشمِ خود دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھیں گے کہ "ہم محمدؐ کے رب پر ایمان لے آئے"۔ اللہ آپ کی سعی کو مشکور فرمائے اور ہمت و استقلال کا دیا جو علامہ پرویزؒ (مجھے یقین ہے کہ جنت الفردوس میں صاحبِ قرآن، شاہِ انبیاء، نبیٔ اکرم صلعم نے ان کو اپنے سینے سے لگا کر اس قدر چوما ہوگا کہ اس طربیہ کیفیت سے وہ سب ایذائیں بھول گئے ہوں گے، جو ہندو پاک کے جادوگروں نے ان کو پہنچائی تھیں) نے جلایا اور آپ تک پہنچ کر اب مشعل بن گیا، آنے والے وقت میں کوہ ہمالیہ بن جائے۔ آمین۔

آزاد کشمیر کے ضلع پونچھ کے ایک انتہائی پسماندہ علاقہ بنام کاہنڈی (KAHNDI) جو دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ واقع ہے جہاں جہالت ویسے ہی ہے جیسے قبل از نبوت عرب معاشرے میں تھی صرف ایک استثنیٰ کے ساتھ کہ ابھی تک بیٹیوں کو زندہ درگور کرنا نہیں شروع کیا گیا۔ باقی کچھ فرق نہیں، کا رہنے والا ہوں۔ قبائلی طرزِ زندگی ہے، درندگی ہے ــــ توہم پرستی ہے۔ نہ منزل ہے نہ راستہ۔ گذشتہ سولہ سال سے بڑی اضطراب انگیز کیفیت سے دوچار رہا ہوں یہ منطق فہم سے بالاتر تھی کہ خود پیدا کرتا ہے، اور پہلے ہی لکھ دیتا ہے کہ یہ آگ میں پھینکا جائے گا اور وہ باغات میں گرل فرینڈز (حوروں) سے فلرٹ کرے گا اور امریکن پوری کی طرح شراب میں دھت بدمستیاں کرے گا۔ اگر اختیار کا یہی استعمال ہے تو پھر تو ہمارے تھانیدار صاحب سب سے بہتر آدمی ٹھہرے۔ مولوی صاحب کو میدانوں میں گرجتے ہوئے آپ نے سنا ہے لیکن پہاڑوں میں نہ سنا ہوگا۔ یہاں لاؤڈ اسپیکر کی آواز جب پہاڑوں سے ٹکراتی ہے تو (ECHO) ایک قیامت برپا کر دیتی ہے۔ مولوی صاحب نے جنت کے لئے شرط یہ رکھی ہوئی تھی کہ شلوار کا پائنچہ ٹخنوں سے اوپر ہو تو آدمی جنت میں جاتا ہے اور اسی طرح کے دیگر قُولو وقالَ۔ کرو کچھ بھی مت۔ صرف چندہ دو۔ یہ جنت مجھے ناممکن سی لگتی رہی اور اپنے طور پر سوچتا رہا کہ اس رسّی کا یہ سرا کہاں ہے اور وہ کہاں۔ الغرض مولویوں کے ایک سالانہ جلسے میں شریک ہوا۔ (نعتیں سننے کی غرض سے)۔ وہاں ملتان، جہلم، لاہور، گوجرانوالہ اور متعدد دیگر مقامات سے مولوی شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ ایک کوئی مولوی صاحب تھے، خدا ان کا بھلا کرے کہ انہوں نے احادیث کی اہمیت بیان کرنا شروع کر دی اور اس قدر گرم ہو گئے کہ کسی کا نام لے کر لے کر وہ گالیاں بکنے لگے۔ اور وہ نام تھا "پرویز" جو اُس وقت تک میں نے نہیں سنا ہوا تھا۔ میں نے ایک سکول ٹیچر سے پوچھا کہ یہ پرویز کون ہیں۔ وہ بے التفاتی سے کہنے لگا کہ بھئی یہ منکرِ حدیث ہے۔ میں نے پوچھا۔ آپ کے سکول کی لائبریری میں ان کی لکھی ہوئی کوئی کتاب ہے، تو کہنے لگا کہ ہاں، "انسان نے کیا سوچا" نام کی کتاب پڑھی ہوئی ہے۔ کسی طرح اثر و رسوخ استعمال کر کے ایک ہفتہ کے لئے وہ کتاب حاصل کی۔ اوّل تا آخر پڑھا اور اس سے مزید یہ پتہ چلا کہ ایک اور کتاب "خدا نے کیا کہا" یا "اسلام کیا ہے" نام کی کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ ڈھونڈ کر راولپنڈی سے حاصل کی۔ پھر ایک ایک کر کے سب ہی (تقریباً) خریدیں جو ادارہ طلوعِ اسلام کی PUBLISHED ہیں۔ قرآن کی اہمیت سمجھ میں آ گئی۔ وہ راستہ مل گیا جو قرآن کی بارگاہ تک پہنچاتا ہے۔ جہاں انسان اور انسانیت کے تقاضے، اس کے مسائل اور اُن کے حل کی موجودگی کا یقین آ گیا۔ برصغیر کے مسلمانوں پر ہمیشہ بڑا کرم رہا خدا کا۔ لیکن اس سے بڑا کرم اور کوئی نہ ہوا ہوگا کہ یہاں علامہ پرویزؒ کو پیدا فرما دیا اور پاکستان کے مسلمانوں کے لئے ادارہ طلوعِ اسلام قائم کر دیا۔ کاش اب اللہ سب کو دیدۂ بینا بھی عطا فرما دے۔

مشتاق احمد خاں
بھالگراں ضلع پونچھ ــ آزاد کشمیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Federal Shariat Court

Islamabad April 15,1992

Dr.Sajidur Rahman Siddiqui
Research Adviser
Tele:820486

Dear Sir,

I am directed by the Hon'ble Chief Justice of the Federal Shariat Court, Mr.Justice Dr.Tanzil-ur-Rahman, to reply your letter in which you have raised an issue with regard to Section 8 of the Offence of Zina(Enforcement of Hudood)Ordinance,1979 (Ordinance No.VII of 1979) which relate to the proof of Zina-bil-Jabar liable to Hadd.

The Federal Shariat Court has already given its judgment on the provision of law mentioned above in Shariat Petitions No.10/K to 14/K of 1983 (PLD-1989 Part-I FSC-95). Appeal on the judgment of the Federal Shariat Court has been filed before the Appellate Shariat Bench of the Supreme Court of Pakistan.It is respectfully submitted for your kind information please.

With best regards,

Yours sincerely,

(DR SAJIDUR RAHMAN SIDDIQUI)

Dr.Syed Abdul Wadood,
50-Usman Block,
Garden Town,
LAHORE

نسخہ اور اس کا استعمال

حکیم صاحب کا مطب

حکیم صاحب کا کمرہ مریضوں سے بھر رہا تھا۔ حکیم صاحب باری باری ایک مریض کی نبض دیکھتے۔ شاگرد کو نسخہ لکھوا دیتے۔ مریض آگے بڑھ جاتا اور شاگرد سے نسخہ بھی لے لیتا۔ اور ترکیب استعمال بھی سمجھ لیتا۔ ایک مریض جب نسخہ لے کر جانے لگا تو حکیم صاحب نے خاص طور پر پوچھا کہ ترکیب استعمال سمجھ لی ہے۔ اس نے کہا جی ہاں! گرم پانی میں اچھی طرح جوش دے کر۔ چھان کر سوتے وقت پی لینا ہے۔ ایک ہی مرتبہ۔ حکیم صاحب نے سر ہلایا اور کہا کہ ہاں! احتیاط سے پینا اور کل صبح آکر اطلاع دینا۔ مرض کو معمولی نہ سمجھنا۔

دوسری صبح مریض پھر آیا۔ حکیم صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھا اور پوچھا کہ ہاں کچھ فرق محسوس ہوا۔ مریض نے کہا نہیں حضور! کچھ فرق نہیں، بلکہ آج تو تکلیف کچھ اور بڑھ گئی ہے۔" حکیم صاحب گہری سوچ میں پڑ گئے۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ لمبی سانس لی۔ اور کچھ یاس آمیز لہجہ میں کہا، اچھا لاؤ نسخہ دکھاؤ۔"

"نسخہ"؟ مریض نے کہا "حضور! نسخہ تو میں نے جوش دیکر پی لیا۔ نسخہ کہاں سے نکالوں؟" حکیم صاحب نے گھبرا کر آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ "کیا کہا نسخہ پی لیا" "جی حضور! نسخہ جوش دیکر چھان کر پی لیا۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چھلنی میں رہ گئے تھے انہیں میں نے پھینک دیا تھا۔" حکیم صاحب کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ جوش غضب میں بولے "ارے بدبخت۔ ایسا احمق! نسخہ کو جوش دے کر پی گیا۔" مریض حیران تھا کہ اس سے کیا خطا ہو گئی۔ اس نے تو بالکل ویسے ہی کیا تھا جیسا اس سے کہا گیا تھا۔ حکیم صاحب نے پھر چلا کر کہا "ارے بے وقوف! کبھی نسخہ کو جوش دیکر بھی پیا کرتے ہیں؟" مریض ابھی تک ششدر تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا معمہ ہے؟ حکیم صاحب نے اپنی ڈانٹ کو جاری رکھتے ہوئے کہا "پاگل! نسخہ میں جو دوائیاں لکھی تھیں انہیں دوائی خانہ سے لینا تھا اور وہ دوائیاں جوش دے کر پینی تھیں نہ کہ اس کاغذ کے ٹکڑے کو جوش دینا تھا جس پر دوائیاں لکھی تھیں۔" مریض کو اب معلوم ہوا کہ اس کے مرض میں افاقہ کیوں نہیں ہوا؟

مریضوں کے ہجوم میں ہر شخص اس مریض کی حماقت پر ہنستا ہوا واپس آگیا۔ شام تک شہر کے گلی محلے میں نسخہ کے اس انوکھے استعمال کا چرچا ہونے لگا۔ جو سنتا، قہقہہ لگاتا۔ لیکن نہ سمجھتا کہ یہ ہنسنا اس مریض پر نہیں، خود اپنے آپ پر ہنسنا ہے

آپ کی اپنی حالت

سے آج سے تیرہ سو برس پہلے ایک ایسے حکیم مطلق نے نسخہ دیا تھا جس کی صداقت پر اس کا ایمان ہے۔ وہ نسخہ انسانیت کے تمام کہنہ اور پیچیدہ امراض کی مکمل تشخیص کے بعد مرتب ہوا تھا۔ لیکن اس نے اس نسخہ کے ساتھ بعینہٖ وہی کچھ کیا جو اس مریض نے کیا تھا جس کی حماقت پر یہ یوں ہنستا ہے۔ اس نے اس نسخۂ عظیمہ کو مقدس غلافوں میں لپیٹ کر رکھا۔ کبھی تعویز بنا کر گلے میں لٹکایا۔ کبھی زعفران اور مشک و عنبر سے لکھ کر دھو دھو کر پینا شروع کر دیا۔ کبھی دوائیوں کے نام کی گنتی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ کہ مرض روز بروز بڑھتا گیا، اور مشکل اندر مشکل یہ کہ جب کبھی کسی نے سمجھانے کی کوشش کی کہ نسخہ کا استعمال صحیح نہیں ہو رہا تو جھلا کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔ پھر طرہ یہ کہ نسخہ کے اس انوکھے استعمال میں کچھ عوام ہی مبتلا نہیں، بلکہ ایسی ایسی جلیل القدر ہستیاں بھی جنہیں خود طبیب ہونے کا دعوےٰ ہے کہیے جس قوم کی حالت یہ ہو جائے۔ اس کی شفایابی کی کیا امید ہو سکتی ہے؟ افسوس کہ مسلمان نے یہ سمجھا ہی نہیں کہ وہ نسخۂ کیمیا جو کائنات کے حکیم و خبیر نے عطا کیا تھا۔ اس کی عظمت کیا ہے۔ وہ عدیم المثال اور عدیم المرتبت نسخہ جس کے متعلق اس حکیم مطلق کا ارشاد

قرآن کی عظمت

ہے کہ: فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۔ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۔ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۙ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (۵۶/۷۵-۷۸) "اے راہ گم کردہ انسانو! میں تمہیں اس لامحدود وسعتوں والے آسمان کے ستاروں کے بلند مقامات کو گواہ ٹھہرا کر کہتا ہوں۔ اگر تمہیں علم ہوتا تو سمجھ لیتے کہ یہ شہادت کتنی عظیم الشان شہادت ہے کہ یہ قرآن بڑی ہی قابل قدر و عزت کتاب ہے (جس کے حقائق فطرت کے چھپے ہوئے صحیفے میں لپٹے پڑے ہیں) لیکن اس کے حقائق کو سمجھنے کے لئے قلب و نظر کی پاکیزگی ضروری ہے۔ یہ اس خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب ہے جو تمام کائنات کی پرورش کرنے والا ہے۔"

غور فرمائیے! رصد گاہِ آسمانی کی بے پناہ بلندیوں کو گواہ ٹھہرا کر بتایا جاتا ہے کہ یہ قرآن کس قدر عظمت و توقیر، عزت و تکریم والی کتاب ہے۔ یہ نسخۂ عظیمہ کیسا نایاب اور بے مثال اور اپنے اثر اور نتیجہ کے لحاظ سے کیسا بلند اور یقینی ہے۔ لیکن اس کا اثر اور نتیجہ تو انہی کے لئے ہوگا جو اسے صحیح طور پر استعمال کریں گے۔ جو اسے "جوش دے کر پی جائیں گے" انہیں فائدہ تو ایک طرف الٹا نقصان ہوگا۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ

اِلاَّ خَسَارًا (۱۷/۸۲)

"اور ہم نے جو کچھ قرآن میں نازل کیا ہے وہ ایمان والوں کے لئے (اکسیر، شفا اور رحمت ہے لیکن جو اس کا صحیح[1] استعمال نہیں کرتے ان کے لئے نقصان میں اضافہ کرنے کا موجب ہوتا ہے"

قرآن کا صحیح استعمال

قرآنِ کریم کا صحیح استعمال کیا ہے؟ اس کے لئے صرف اس قدر سمجھ لینا کافی ہے کہ یہ تمام نوعِ انسانی کے لئے ضابطۂ زندگی ہے۔ اس ضابطہ کو پڑھا اس لئے جاتا ہے کہ سمجھ میں آجائے اور سمجھا اس لئے جاتا ہے کہ زندگی اس کے مطابق بسر کی جائے۔ لیکن اگر نسخے کے الوکھے استعمال کی طرح اس ضابطۂ زندگی کو بازوؤں سے باندھ لیا جائے، گلے میں لٹکا لیا جائے۔ گھول گھول کر پینا شروع کر دیا جائے۔ اس کے الفاظ و حروف کی گنتی شروع کر دی جائے اور توقع یہ کی جائے کہ جو فوز و فلاح اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ ہے وہ ہمیں اس الوکھے مگر سہل طریقے سے ہی مل جائے گی، تو نتیجہ سوائے نقصان کے اور کیا ہو گا۔

قرآن ایک عملی تحریک کا بے مثال ضابطہ ہے۔ اور اس کے زندہ و پائندہ، درخشندہ و تابندہ نتائج اسی وقت مرتب ہو سکتے ہیں جب اس کی حامل قوم کا عمل اس کے متعین کردہ نظام کے مطابق ہو۔ نہ یہ کہ اس کے حروف و الفاظ کو گھول گھول کر پیا جائے۔ قرآن کا یہی وہ بے محل استعمال (ظلم) ہے جس کا نتیجہ خسران و نقصان کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ خود قرآن ہی کا فیصلہ ہے۔

اس سے پیشتر طلوعِ اسلام[2] کے صفحات پر قرآنِ کریم کے اسی بے محل استعمال کے چند نمونے پیش کئے جا چکے ہیں جو ہمارے علومِ دینیہ کے مرکز دیوبند شریف سے شائع ہونے والے رسالہ "خالد" سے نقل کئے گئے تھے۔ آج اسی قبیل سے کچھ اور پیش کیا جاتا ہے۔ ان کی اہمیت اس لئے ہے کہ یہ ایک بزرگ ہستی کے تجویز فرمودہ ہیں جو ہندوستان کے اربابِ شریعت و طریقت میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی تھی۔ علومِ شریعت میں بھی مرجعِ انام تھی اور رموزِ طریقت میں بھی بے شمار انسانوں کے نزدیک منبعِ فیوض۔ قرآنِ کریم کے مفسر و مترجم۔ بے شمار کتبِ دینیہ کے مصنف اور ایک بہت بڑے آستانہ کے مسند نشین۔ ان کی وفات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ان کے ارشادات کو دیکھئے اور پھر غور فرمائیے کہ جب خود ایک حکیم الامت نسخہ کو جوش دے کر پینا شروع کر دے اور اسی کی تلقین کرے تو مریضوں کا خدا حافظ!

اعمالِ قرآنی

لیجئے اب وظائف ملاحظہ فرمائیے! قارئین کی سہولت کے لئے ہر ایک وظیفہ

---

[1] ظلم کے معنی ہیں۔ وضع الشئی فی غیر موضعہ المختص بہ (المفردات) کسی شئے کا غیر محل استعمال۔

[2] یہ مضامین ماہنامہ طلوعِ اسلام میں شائع ہوئے تھے۔

کے بعد ہم نے آیتِ متعلقہ کا ترجمہ (جس کا مفہوم سمجھ میں آجائے) قوسین میں لکھ دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

(۱) فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ (۲/۷۱)

خاصیت :- یہ آیت پڑھ کر خربوزہ یا کوئی چیز تراشے تو انشاء اللہ تعالیٰ شیریں ولذیذ ہوگی۔

(آیت کا مطلب :- سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل کا ایک واقعہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ ایک گائے (بیل) ذبح کریں۔ انھوں نے اس سیدھے سادے حکم کی تعمیل میں بیسیوں حجتیں کیں۔ اور بصد مشکل اس پر آمادہ ہوئے۔ فذبحوھا۔ پس انہوں نے ذبح کیا وما کادوا یفعلون اور ان کا جی نہیں چاہتا تھا کہ ایسا کریں۔ یہ تھا قرآن کا مفہوم اور یہ ہے اس آیۂ مقدسہ کا استعمال جسے حکیم الامت نے تحریر فرمایا ہے۔ غالباً لفظ ذبح سے مطلب خربوزہ تراشنا لیا گیا ہے۔)

(۲) اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (۳/۸۲)

خاصیت :- اگر سواری کا کوئی جانور گھوڑا اونٹ سواری کے وقت شوخی اور شرارت کرے اور چڑھنے نہ دے تو اس آیت کو تین مرتبہ پڑھ کر اس کے کان میں پھونک دے انشاء اللہ تعالیٰ سیدھا ہو جائے گا۔

(آیت کا مطلب :- کیا یہ لوگ اللہ کے قانون کی اطاعت کے علاوہ کوئی اور ضابطۂ حیات اپنے لئے اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ (انھیں دیکھنا چاہیئے کہ) آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے طوعاً و کرہاً اسی کے (قانون کے) سامنے جھکا ہوا ہے اور سب کی گردشیں اسی محور کے گرد ہیں۔ یعنی جب کائنات کی ہر شئے اللہ کے قانونِ مشیت کے ماتحت زندگی بسر کر رہی ہے تو کیا انسان جو خود کائنات ہی کا ایک جزو ہے اپنے لئے قرآن کے علاوہ کوئی اور ضابطۂ زندگی اختیار کرنا چاہتا ہے۔

۳۔ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ۭ مَا مِنْ دَاۗبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۱/۵۶)

خاصیت :- اگر کوئی لونڈی یا غلام سرکش ہو تو بال پیشانی کے پکڑ کر تین مرتبہ اس کو پڑھے اور اس پر دم کرے۔ انشاء اللہ تعالیٰ تابعدار اور مسخر ہو جائے گا۔

(آیت کا مطلب :- میں اس اللہ پر بھروسا کرتا ہوں جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے (اور جس کا قانونِ مکافاتِ عمل ایسا محکم گیر ہے کہ) کوئی جاندار ایسا نہیں جسے وہ پیشانی سے پکڑ کر اس سے مؤاخذہ نہ کرے۔ یقیناً میرا رب ایک متوازن ہموار راستہ پر ہے یعنی اللہ کے قانونِ مکافاتِ عمل کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

(۴) كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ (۱۸/۱۸)

خاصیت :- اگر راستہ میں شیر یا کتا حملہ کرے اور شور مچا دے تو فوراً اس آیت کریمہ کو پڑھ لے چپ ہو جائے گا۔

(آیت کا مطلب :- سورۂ کہف میں ہے کہ اصحاب کہف کا کتا اپنے بازو پھیلائے غار کے منہ پر بیٹھا ہے۔ آیت اور اس کی خاصیت کا باہمی ربط ظاہر ہے۔)

۵۔ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۙ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۙ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ وَ اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۙ (۸۴/۱-۴)

خاصیت :- ان آیتوں کو لکھ کر ولادت کی آسانی کے لئے بائیں ران میں باندھ دے، انشاء اللہ تعالیٰ بہت آسانی سے ولادت ہوگی۔ مگر بعد ولادت تعویذ فوراً کھول دینا چاہیئے۔ اور اس عورت کے سر کے بال کی دھونی مقام خاص پر دینا مفید ولادت ہے۔

(آیات کا مطلب :- یہ سورۂ انشقاق کی آیات ہیں جن میں قیامت کی نشانیوں کا ذکر ہے۔ ترجمہ یہ ہے " جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کا حکم سن لے گا اور وہ اس لائق ہے۔ اور جب زمین کھینچ کر بڑھا دی جائے گی۔ اور زمین اپنے اندر کی چیزوں کو اگل کر خالی ہو جائے گی۔" ربط ظاہر ہے)۔

۶۔ اگر دردِ زہ سے تکلیف ہو تو عورت موطا امام مالکؒ (مجموعہ احادیث) پر ہاتھ رکھے فوراً ولادت ہو جائے گی۔

۷۔ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۚ (۲/۱۳۷)

خاصیت :- جس سے حاکم ناراض و خفا ہو وہ اس آیت کو پڑھا کرے یا لکھ کر بازو پر باندھ لیوے۔ انشاء اللہ تعالیٰ حاکم مہربان ہو جائے گا

(آیت کا مطلب :- اللہ نے حضورؐ کو تسلی دی ہے کہ ان سرکش مخالفین کی فتنہ انگیزیوں سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اللہ ان سب کے خلاف تیرے لئے کفائت کرے گا۔ وہ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے۔)

۸۔ جو شخص سالوں حٰمٓ کو پڑھا کرے اس پر دوزخ کے ساتوں دروازے بند ہو جائیں گے۔

۹۔ هُوَ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (۵۹/۲۲)

خاصیت :- اسم اعظم اس میں مخفی ہے۔ جو کوئی صبح کے وقت سات مرتبہ پڑھے تو شام تک اس کے واسطے فرشتے دعائے مغفرت کریں، اور اگر اس دن میں مرے تو شہید کا مرتبہ پائے گا۔ اور اگر شام کو پڑھے تو صبح تک اس کے واسطے فرشتے دعائے مغفرت کریں اور جو اس شب میں مرے تو درجہ شہادت کا پاوے۔

ترجمہ :۔ اللہ کی ذات وہ ہے کہ جس کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں۔ وہ غیب و شہادت کا جاننے والا اور رحمٰن و رحیم ہے۔

۱۰۔ اَلقیّوم۔

خاصیت :۔ اس کے پڑھنے سے کثرت سے نیند آتی ہے۔
(القیوم۔ یعنی ایسا قائم کہ جسے اپنے قیام و بقا کے لئے کسی آسرے کی ضرورت نہ ہو۔ غالباً "نیند" کی طرف خیال اس لئے گیا کہ القیوم کے بعد ہے کہ نہ اسے نیند چھو سکتی ہے نہ غنودگی۔ حالانکہ القیوم کی تاثیر سے تو سونے والوں کو بھی بیدار ہو جانا چاہیئے!)

۱۱۔ اَلمُغنِی

خاصیت :۔ اگر مشغولیٔ جماع کے وقت خیال سے پڑھے تو بیوی اس سے محبت کرنے لگے۔ (المغنی۔ سب سے بے نیاز اور سب کا حاجت رَوا۔)

۱۲۔ الرحمٰن الرحیم

خاصیت : اگر طالب مطلوب کا نام مع نام والدہ کے لکھے، اس کی محبت میں سرگرداں ہو بشرطیکہ جائز محبت ہو۔

۱۳۔ اناللہ و انا الیہ راجعون ط

خاصیت: اگر یہ آیت پڑھ کر گُم ہوئی چیز کی تلاش کی جائے تو انشاء اللہ تعالےٰ ضرور مِل جائے۔ ورنہ غیب سے کوئی چیز اس سے عمدہ ملے گی۔
(مطلب آیت :۔ قرآنِ کریم میں مصائب و مشکلات میں استقامت کی تلقین کے بعد فرمایا کہ جماعت مومنین کا مطمعِ نگاہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہماری تمام جدّو جہد مشیت کے پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے اور ہماری سعی و عمل کی تمام گردشیں اسی کے قانون کے محور کے گرد گھومتی ہیں۔

۱۴۔ یَا اَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ اِنَّ زَلْزَلَۃَ السَّاعَۃِ شَیْئٌ عَظِیْمٌ ۲۲/۱

خاصیت :۔ حفظِ حمل کے لئے مفید ہے۔

۱۵۔ اگر پوری سورۂ نوح سوتے وقت پڑھ لی جائے تو احتلام سے محفوظ رہے گا۔

ایک اور وظیفہ اتنے ہی ارشادات کافی ہیں۔ زیادہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ورنہ کتاب میں تو بڑے بڑے دلچسپ خواص لکھے ہیں۔ ان وظائف وغیرہ کا نام رکھا جاتا ہے "قرآن کے اعمال" حالانکہ

قرآن کا عمل تو صرف وہی عمل کہلا سکتا تھا جو قرآن کے احکام کے اتباع میں سرزد ہو۔ مؤلف کتاب نے ایک اور دلچسپ وظیفہ بھی لکھا ہے۔

احقر کو مرشدی نے ارشاد فرمایا تھا کہ اگر کوئی حاجت مند تعویذ وغیرہ لینے آوے تو انکار مت کیا کرو۔ چنانچہ احقر کا معمول ہے کہ اس کی حاجت کے مناسب کوئی آیت قرآنی یا کوئی اسم الٰہی سوچ کر لکھ دیتا ہے۔ اور بفضلہ تعالےٰ اس میں برکت ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک بی بی کی مانگ باوجود کوشش بار بار کے سیدھی نہ نکلتی تھی۔ احقر نے کہا اھدنا الصراط المستقیم پڑھ کر مانگ نکالو۔ چنانچہ اس کا پڑھنا تھا کہ مانگ بے تکلف سیدھی نکل آئی۔ احقر نے یہ حکایت اس لئے عرض کی ہے کہ اور کوئی طالب بھی اس معمول کو اختیار کرے تو امید نفع اور برکت ہے۔

غور فرمایئے! ان "اعمالِ قرآنی" نے خود قرآنِ کریم اور اس پر ایمان رکھنے والوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ اس زندگی میں فراخیٔ رزق۔ نیک اولاد۔ دشمن پر غلبہ۔ عزت کی زندگی۔ شیطان سے دُوری۔ غیبی خزانوں کا علم، چوری سے حفاظت، ادائیگیٔ قرض، جملہ جسمانی امراض سے شفا اور آخرت میں جنّت، شہادت کا مرتبہ۔ رسولؐ اللہ کی شفاعت دوزخ سے نجات، غرضیکہ اس دنیا میں اور آئندہ زندگی میں جس چیز کی بھی تمنّا کی جا سکتی ہے اس کے متعلق چند وِرد وظائف کے پڑھنے سے، یا اگر پڑھ نہ سکتا ہو تو لکھ کر چاٹ لینے سے یا بازو پر باندھ لینے سے غیر مشروط طور پر گارنٹی دی گئی ہے۔ اور کوئی ایسی ضرورت باقی نہیں رکھی گئی جس کے لئے قرآن کریم کو ضابطۂ حیات بنایا جائے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک اس قسم کے اعمالِ قرآنی جو محمد الرسول اللہ والذین معہٗ کا ضابطۂ زندگی بنے تھے۔ کچھ پیچیدہ اور لمبے راستے ہیں اس لئے ان کی جگہ اس زندگی میں کامیابی اور آخرت میں سرفرازی کیلئے (SHORTCUT) قرآن کی آیات کے ان "باطنی معانی" میں مضمر ہے جن پر عمل پیرا ہونے کے لئے کسی صبر آزما مرحلے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اور یوں مفت میں بیٹھے بٹھائے جنّت مل جاتی ہے۔

بہشتے بہرِ ارباب ہمم است ——— بہشتے بہرِ پاکان حرم است
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش ——— بہشتے فی سبیل اللہ ہم ست

اثر کس طرح ہوتا ہے

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب! ان اوراد و وظائف کو خود کر کے دیکھ لیجئے۔ ان میں واقعی اثر ہوتا ہے۔ یہ اثر اس لئے نہیں ہوتا کہ وِرد قرآن کی آیت کا کیا گیا ہے۔ جو لوگ قرآنِ کریم سے واقف بھی نہیں اور کھلا ہوا شرک کرتے ہیں وہ بھی ایسے ایسے اعمال کرتے اور بتاتے ہیں جو تاثیر کے اعتبار سے ان اوراد و وظائفِ قرآنی سے بڑھ چڑھ کر ہوتے ہیں کیونکہ تاثیر زیادہ تر عمل کرنے والے کی فنی قابلیت پر منحصر ہوتی ہے اس PHENOMENON کا تعلق علم النفس (PSYCHOLOGY)

سے ہے۔ ایک خاص طریقے سے جن الفاظ کو بھی بطور وظیفہ پڑھئے یا لکھئے اس قسم کے اثرات پیدا ہو جاتے ہیں تفصیل اس اجمال کی طویل ہے جسے ہم انشاء اللہ کسی دوسرے موقع پر پیش کریں گے۔ اس وقت تو صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ کس طرح نسخہ کا یہ الوکھا استعمال طبیبِ مطلق کے بتائے ہوئے علاج سے باز رکھتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وارثینِ کتاب کی وہ جماعت جسے دنیا کی امامت کیلئے پیدا کیا گیا تھا آج دنیا میں سب سے پیچھے ہے۔ ان کی وہ عملی قوتیں جو انہیں دنیا کے سخت سے سخت مقابلہ میں سینہ سپر کر دیا کرتی تھیں، مفقود ہو چکی ہیں۔ قرآنِ کریم کی برکت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی برکت اس پر عمل پیرا ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ جھاڑ پھونک اور گنڈا تعویذ سے برکت حاصل کرنے کا ذکر قرآن میں کہیں نہیں۔ یہ سب عجمی اثرات کا نتیجہ ہے۔

(پرویز صاحب کی کتاب فردوس گم گشتہ سے اقتباس)

قانونِ خداوندی کی میزان جان و مال سے جدوجہد کرنے والوں کے مدارج سہل انگاروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے

استحکامِ ذات

کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے آپ سے آگے بڑھ کر نوعِ انسانی کے مفادِ کلی اور عالمگیر ربوبیت کا انتظام کرے۔

اصل سوال خدا کی ہستی کا نہیں بلکہ اس امر کا ہے کہ خدا بذریعہ وحی انسانوں کی راہنمائی کرتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اعزاز الدین احمد خاں

مذہبی پیشوائیت اور قرآن

قرآن کے الفاظ میں "اللہ کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مذہبی پیشوائیت کا وجود ہے۔" (سورہ توبہ۔ آیت ۳۴)

ازلی کش مکش

میرا یہ مقالہ سورۂ توبہ کی آیت ۳۴ اور علامہ اقبالؒ کے اس شعر کے گرد گھومتا ہے کہ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

وہ کونسی کش مکش ہے جس کا سلسلۂ دراز، نوعِ انسان کی پوری تاریخ کو محیط ہے۔ وہ کونسے حریف ہیں جن کی باہمی ستیزہ کاری (جھگڑنے) کا سلسلہ، ہر دور میں جاری رہا اور اب تک جاری ہے۔ آپ انسانی تاریخ پر جس قدر بھی غور کریں گے ایک ہی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ وہ کش مکش پیہم دین اور مذہب کی جنگ ہے۔

آجکل "دین و مذہب کی یہ جنگ" پاکستان میں جاری ہے۔ ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت، جو بالعموم اُن علماء (یا اُن کے شاگردوں) پر مشتمل ہے جنہوں نے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی تھی، کی کوشش ہے کہ پاکستان میں اسلام بہ حیثیت مذہب ہی زندہ رہے، اسلامی نظام کی شکل اختیار کرنے نہ پائے جس کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ انہیں ڈر ہے کہ اگر یہاں اللہ کا نظام قائم ہوگیا تو ان کی اجارہ داریاں ختم ہوجائیں گی۔ اس لئے یہ چاہتے یہ ہیں کہ یہاں اسلام کی وہی شکل باقی رہے جس شکل میں یہ چلا آرہا ہے۔ کیا یہ سازش نہیں ہے کہ مسلمانوں کو ایسی مملکت مل جانے کے بعد بھی جسے انہوں نے نظامِ خداوندی (دین الحق) کے قیام کے لئے حاصل کیا تھا، یہاں وہ نظام قائم نہ ہو، اسلام بدستور مذہب کی شکل میں باقی رہے!؟

مذہبی پیشوائیت کیا چاہتی ہے؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کی وہ شکل کیا ہے جسے مذہبی پیشوائیت

باقی رکھنا چاہتی ہے۔ مختصراً اسے یوں سمجھئے کہ جو کچھ انبیائے سابقہ کے قائم کردہ دینی نظام کے ساتھ ہوا، وہی کچھ اسلام کے ساتھ بھی بیتی۔ صدرِ اوّل کے بعد، ملوکیت نے سر ابھارا اور اس کے ساتھ مذہبی پیشوائیت وجود میں آگئی۔ دین دو حصّوں میں تقسیم ہوگیا۔ دنیاوی امور اور دینی امور کو الگ الگ کر دیا گیا۔ دنیاوی امور (پبلک لاز) حکومت کی تحویل میں رہے اور دینی امور (پرسنل لاز) کی مالک مذہبی پیشوائیت بن بیٹھی۔ "دینی امور" سے مراد اعتقادات عبادات اور شخصی قوانین، مثلاً نکاح وطلاق وغیرہ ہیں اور پھر دنیاوی امور میں حکومت کے فیصلے نافذ ہونے لگے اور دینی امور میں مذہبی پیشوائیت (علماء و مشائخ) کے فتوے چلنے لگے۔ یوں دین، مذہب میں تبدیل ہوگیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایسے نظام کو جس میں انسانی زندگی کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے، سیکولرازم کہتے ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ مذہب میں نظامِ حکومت لازمی طور پر سیکولر ہو جاتا ہے۔ اسلام کی یہ شکل (یعنی ملوکیت کے دور کے "سیکولر" اسلام کی شکل) اس وقت تک قائم ہے، اسی کو مذہبی پیشوائیت قائم و دائم رکھنا چاہتی ہے اور اسی کی رُو سے کہا جاتا ہے کہ اتباعِ شریعت کے لئے اپنی آزاد مملکت کا وجود ضروری نہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ارکانِ اسلام کا اتباع ہر حکومت کے تابع رہ کر کیا جا سکتا ہے۔ اس سے اسلام کا منشا پورا ہو جاتا ہے۔ سُن رکھئے کہ ایسے اسلام کا قیام ہماری منزل نہیں۔ یہ تصوّر یکسر غیر قرآنی ہے۔

ہماری منزل کیا تھی؟

کتاب اللہ (قرآنِ حکیم) نے دنیاوی اور دینی امور کو دو حصّوں میں تقسیم نہیں کیا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران نیشنلسٹ علماء (وہ حضرات جو اسلام ایک آئیڈیالوجی کی بجائے وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دیتے تھے) ہیں اور علامہ اقبالؒ (اور ان کے ہمنواؤں) کے درمیان یہی نقطہ مابہ النزاع تھا۔ نیشنلسٹ علماء کا مؤقف یہ تھا کہ ہندو ہمیں اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو "مذہبی آزادی" حاصل ہوگی اور مطالبۂ پاکستان کے مدعیوں کا کہنا یہ تھا کہ قرآن کی رُو سے اس آزادی کو آزادی کہا ہی نہیں جا سکتا۔ اس میں آزادی سے مراد "دین کی آزادی" ہے۔ نیشنلسٹ علماء کے اسی مؤقف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

ہم نے بہرحال "دین کی آزادی" کے لئے مملکتِ پاکستان کو حاصل کر لیا۔ لیکن وائے برحال ما، کہ ہم نے یہاں وہی سیکولر نظام جاری رکھا جو دورِ ملوکیت میں رائج تھا۔ آئین کی رُو سے تو ہماری مملکت "اسلامی جمہوریہ" ہے، لیکن عملاً یہاں یہ حالت ہے کہ مرکزی حکومت کی مختلف وزارتوں میں سے ایک وزارت "امورِ مذہبیہ" کی

بھی ہے۔ گویا "مذہبی امور" ان امور سے الگ ہیں جو دیگر وزارتوں سے متعلق ہیں ـــــ امورِ مذہبیہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اوقاف، حتیٰ کہ مزارات پر عرسوں کی تقریبات وغیرہ شامل ہیں ـــــ کیا یہ وہی سیکولرازم نہیں ہے جسے تحریکِ پاکستان کے دوران نیشنلسٹ علماء پیش کیا کرتے تھے اور جسے غیر اسلامی قرار دے کر ہم نے پھٹکار دیا تھا اگر اسلامی نظام اسی کا نام ہے تو اس کی ضمانت تو ہندو بھی دیتا تھا۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کی منزل ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دی گئی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں اب ہماری حالت یہی ہے ؎

بھٹکا ہوا راہی میں، بھٹکا ہوا راہی تو
منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی؟

جب تک منزل متعین طور پر سامنے نہ لائی جائے، نہ کارواں اپنے مستقر تک پہنچ سکتا ہے نہ متاعِ کارواں، رہزنوں کے ہاتھوں سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے پاکستان کی منزل کی نشاندہی شروع ہی میں کر دی تھی جب کہا کہ ہمارے لئے ایک آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا اور وہ بلند مقصد تھا اور ہے، اس خطۂ زمین میں (یعنی پاکستان میں) صحیح معنوں میں اسلامی مملکت کا قیام۔ (کراچی اکتوبر ۱۹۴۷ء)۔ یہ ہے ہماری منزل۔ اس منزل کے راستے میں سب سے بڑی روک مذہبی پیشوائیت ہے۔ یہ پاکستان میں مذہب کا وہی "سیکولر نظام" باقی رکھنا چاہتی ہے جو ہمارے ہاں چلا آرہا ہے اور جس کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ یہ ہے مذہب اور دین کی "جنگ" جو پاکستان میں جاری ہے۔ اس "جنگ" میں کامیابی مذہبی پیشوائیت کو راستے سے ہٹائے بغیر ممکن نہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم مذہبی پیشوائیت کو سمجھیں اور اس کی چیرہ دستیوں کو بھی۔ یہی اس مقالے کا مقصد ہے۔

مذہبی پیشوائیت کی چیرہ دستیاں

مذہبی پیشوائیت (علماء و مشائخ کا جال ہم پر اس وسعت اور گہرائی سے چھایا ہوا ہے کہ ہم اس کے پھندے سے آسانی سے نکل ہی نہیں سکتے۔ یاد رکھئے! جب تک مذہبی پیشوائیت کا وجود باقی ہے، اللہ کا دین، اسلام ہمارے ہاں قدم نہیں رکھ سکتا۔ یہی وجہ ہے جو قرآن نے اسے دین کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا ہے (۹/۳۴)۔ یہ بات ہم تک ہی محدود نہیں۔ انبیاء گذشتہ اور اقوامِ سابقہ کی جو تاریخ قرآن نے بیان کی ہے اس میں آپ دیکھیں گے کہ ان کی دعوت کی سب سے بڑی مخالفت مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوئی تھی۔ یہی اسلام کے نام پر حاصل کئے جانے والے ملک (پاکستان) میں ہو رہا ہے۔ یہاں بھی مذہبی پیشوائیت اسلام کے درپے ہے۔ گویا تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے اور ہم خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں۔

سُن رکھئے! دین نام ہے زندگی کے ہر گوشے میں، وحی کی روشنی میں اپنی عقل و فکر سے کام لے کر چلنے کا۔ اس کے خلاف "مذہب" (یعنی انسانوں کا خود ساختہ طریق) ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ خدا پرستی اس طریقہ کا نام ہے جس میں انسان عقل و فکر سے کام نہ لے اور جو کچھ اسلاف سے ہوتا چلا آرہا ہے اس پر آنکھ بند کر کے چلتا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد اس قوم میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ یہی ہمارا حال ہو چکا ہے۔ آیئے دیکھیں کہ کس طرح مذہب کے علمبرداروں نے اسلاف پرستی کے نام پر ہماری نگاہوں کے سامنے وحیٔ خداوندی (القرآن) کے واضح احکام کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں۔

مذہبی پیشوائیت کا انتقام

آپ کو معلوم ہے کہ تحریکِ پاکستان کی سب زیادہ مخالفت ہمارے علماء کرام، خصوصاً نیشنلسٹ علماء اور سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب وغیرہ کی طرف سے ہوئی تھی۔ یہ درحقیقت، دین اور مذہب کی وہی کش مکش تھی جو ازل سے تا امروز، باہمد گر ستیزہ کار چل رہی ہے۔ لیکن ان مذہب پرست گروہوں کی مخالفت کے باوجود پاکستان، اللہ کے فضل و کرم سے، وجود میں آگیا۔ پاکستان بننے کے ساتھ ہی یہ تمام مخالف عناصر، نہایت ڈھٹائی سے، پاکستان آگئے اور یہاں آکر لگے شور مچانے کہ چونکہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے، اس لئے ہم بتائیں گے کہ اسلام کسے کہتے ہیں! اور پھر یہ حضرات بڑے بڑے مقدس اور معصوم نقابوں میں اس آتشِ انتقام کو فرو کرنے میں مصروف ہو گئے جو قائداعظمؒ کے ہاتھوں شکستِ عظیم سے ان کے دلوں میں بھڑک اٹھی تھی۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ پاکستان اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا گہوارہ نہ بن پائے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا، بلکہ یہ اسی شکل میں رہے جس میں یہ چلا آرہا ہے یعنی مذہب کی شکل میں۔ چنانچہ ہمارے مذہبی پیشواؤں نے "اسلامی نظام" کا جو خاکہ پیش کیا اس کے دو اہم نکات یہ ہیں:-

(۱) پرسنل لاز ہر مذہبی فرقے کے اپنے اپنے ہوں۔

(۲) پبلک لاز "قرآن و سنت" کے مطابق وضع کئے جائیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ "اسلام" کا یہ خاکہ دین الحق کے یکسر خلاف ہے، اس کی ضد ہے۔ دین الحق یا اسلامی نظام کے معنی ہیں اللہ کی کتاب (قرآن حکیم) کی حکمرانی جس میں مذہب اور سیاست، دین اور دنیا میں ثنویت نہیں ہوتی۔ اب آپ ہی سوچئے کہ پرسنل لاز اور پبلک لاز میں یہ تفریق، مذہب کی ایجاد ہے یا نظامِ خداوندی کا تقاضا!

اب ملکِ عزیز پاکستان میں اسلامی نظام کی بجائے فرقہ پرستی کا دور دورہ ہے۔ ہاں، وہی فرقہ پرستی جسے قرآن

شرک سے تعبیر کرتا ہے۔ (۳۲ - ۳۱/۳۰)۔ ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت (علماء و مشائخ) نے اس "شرک" کو جائز قرار دے رکھا ہے! یہ فسانہ نہیں، حقیقت ہے۔ اس شرک کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اس کا جو نتیجہ ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ آج ملّتِ پاکستانیہ میں اس قدر تشتت و افتراق، اس قدر انتشار و خلفشار، اس قدر نزاعات و اختلافات، اس قدر فقدانِ وحدت و عدم اعتماد ہے، اس کی وجہ فرقہ پرستی کا یہی شرک ہے جو ملّت میں فکری وحدت پیدا نہیں ہونے دیتا۔ لیکن ہمارے مذہبی پیشوا اس شرک کو مٹانے کے لئے تیار نہیں ہیں کیونکہ وہ اپنی عافیت ملّت کی تفریق میں سمجھتے ہیں۔ انہیں ڈر ہے کہ اگر یہاں اسلام کا نظام قائم ہو گیا تو ان کی اجارہ داریاں ختم ہو جائیں گی۔ اس لئے وہ پاکستان میں مروّجہ مذہب کو دین الحق بتا کر ملّت کو تھپکیاں دے دے سلائے رکھتی ہے۔ اب تو انہیں یہ بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔

حال ہی میں پاکستان میں ایک ایسی تبدیلی واقع ہوئی جس سے فرقوں کی پوزیشن یکسر بدل گئی ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان نے جو دستور مرتب کیا ہے (۱۹۸۵ء میں) اور جسے اسلامی دستور قرار دیا گیا ہے، اس میں "مسلمانوں کے مسلّمہ فرقوں" کو آئینی سند عطا کر دی ہے۔ اب ہر مذہبی فرقہ "قرآن و سنّت" کی اصطلاح کو، اپنی اپنی کتبِ روایات و فقہ کی روشنی میں، تشریح و تعبیر کر سکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اب ہر مذہبی فرقے کا الگ الگ اسلام ہے! (دیکھئے دستور کا آرٹیکل نمبر ۲۲۷ (۱) و ضاحتی نوٹ) سوچئے! اسلامی دستور! اور اس میں مذہبی فرقوں کی آئینی حیثیت!! مذہبی پیشوائیت اور ہمارے سیاستدانوں کے گٹھ جوڑ نے نہ صرف ہماری (پاکستان کی) منزل بدل دی بلکہ اللہ کے دین ہی کو بدل ڈالا! اس کے باوجود ہمارا دعویٰ اب بھی یہی ہے کہ ہم "اہلِ ایمان" ہیں اور اللہ کے عطا کردہ ضابطۂ حیات (القرآن) کے ایک ایک لفظ پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ خود فریبی اور خدا فریبی ہمیں لے ڈوبی ہے۔ ؎

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اب آگے بڑھئے۔

قرآن تنہا کافی نہیں ہے

ارشادِ خداوندی ہے کہ "کیا ان لوگوں کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تیری طرف ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جسے تو ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ کتاب جس میں ان لوگوں کے لئے، جو اس کی صداقت پر ایمان لائیں، رحمت بھی ہے اور موعظت بھی۔" (۵۱/۲۹)۔ بالفاظِ دیگر مومنین کے لئے صرف قرآن کافی ہے۔ لیکن ہمارے مذہبی پیشوا بڑے دھڑلے سے کہتے ہیں کہ نہیں، ہمارے لئے قرآن تنہا کافی نہیں۔ اس کے ساتھ اس کی مثل (مثلہٗ معہٗ) کچھ اور چیزوں کی بھی ضرورت ہے۔

چنانچہ اس کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ رسولؐ اللہ کی طرف آنے والی وحی کی دو قسمیں تھیں ـــ ایک وحیٔ متلو، جو قرآن کے اندر محفوظ ہے اور دوسری وحیٔ غیر متلو، جو احادیث کی شکل میں، بعد میں جمع کی گئی ـــ یہ احادیث، قرآن کے ساتھ، قرآن کی مثل ہے۔ قرآن اس عقیدہ کی تردید کرتا ہے (۱۷/۸۸)۔

یہ عقیدہ ہمارے دل کی گہرائیوں میں اس قدر پیوست کر دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ انسانی ہدایت کے لئے صرف قرآنِ حکیم کافی ہے اور یہ کہ وحیٔ خداوندی صرف قرآن کے اندر ہے اس سے باہر نہیں، تو ہمارے یہ مذہبی پیشوا اُسے کافر اور ملحد قرار دے دیتے ہیں۔ یہ حضرات "اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ" میں دو الگ الگ اطاعتیں بتاتے ہیں۔ ایک اللہ کی اطاعت اور دوسری رسولؐ کی اطاعت۔ "اللہ کی اطاعت" کے لئے قرآنِ حکیم اور رسولؐ کی اطاعت کے لئے احادیث۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دین کا آدھا حصہ احادیث میں ہے بلکہ ۹/۱۰ حصہ احادیث میں ہے، صرف ۱/۱۰ حصہ قرآن میں ہے! یہ نہ کہیں تو ان کی "نمبرداری" کیسے قائم رہے! غور فرمایا آپ نے کہ ان حضرات کے مطابق اگر امام بخاریؒ اور دیگر حضرات احادیث جمع نہ کرتے تو "دین کا آدھا حصہ" (معاذ اللہ) بالکل کھو چکا تھا! گویا حضورؐ کی وفات کے بعد اور احادیث مرتب ہونے تک کے درمیانی (۲۰۰ سے ۲۵۰ سال) عرصے میں دین آدھا تھا! خلفائے راشدینؓ کو بھی اس کا خیال نہ آیا۔ سن رکھئے! کہ "اللہ اور رسولؐ کی اطاعت" سے مراد اللہ کی اطاعت ہے۔ رسولؐ چونکہ قوانینِ خداوندی کے مطابق اپنا پروگرام مرتب کرتا ہے، اس لئے اس پروگرام کی اطاعت درحقیقت اطاعتِ خداوندی ہوتی ہے۔ قرآن نے واضح طور پر کہا ہے کہ

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (۴/۸۱)

"جو شخص اس رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے"۔

یعنی قانونِ خداوندی کی اطاعت کرتا ہے۔ اس قرآنی ہدایت کے بعد "دو اطاعتوں" کے عقیدے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ لیکن مذہبی پیشوائیت کو کون سمجھائے۔ ان سے اللہ ہی نمٹے گا (۶/۱۶۰)۔

سُن لیجئے! جب تک احادیث کے مجموعوں کے متعلق "مثلہ معہ" کا عقیدہ رہے گا، اُمت قرآن کی طرف کبھی نہیں آسکتی اور جب تک یہ قرآن کی طرف نہیں آئے گی، نہ اس کے اختلافات دُور ہوں گے، نہ فرقہ پرستی ختم ہوگی اور نہ انتشار کا خاتمہ ہوگا۔ یعنی نہ اُمت میں وحدت پیدا ہوگی نہ اسلامی نظام قائم ہو سکے گا، نہ اسلامی مملکت وجود میں آسکے گی۔ اسلامی مملکت کی بنیادی شرط ساری مملکت میں ایک ضابطۂ قوانین کا نفاذ ہے۔ لیکن مروّجہ احادیث کی موجودگی میں اس قسم کا ضابطہ مرتب ہونا ناممکن ہے۔ اس صورتِ حال کا سہل علاج قرآنی علاج ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا۔ (۳/۱۰۲)۔ ـــ

قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار (اقبالؒ)

"اللہ کے نظام (دین) کے ساتھ محکم طور پر وابستہ ہو جاؤ اور امت میں فرقہ پرستی کو نزدیک مت آنے دو کہ (فرقہ پرستی شرک ہے)۔" (۳۲-۳۱/۳۰)

کاش ہم اللہ کی کتاب (القرآن) کی آواز کو سُنیں! لیکن ہماری حالت اب وہی ہو چکی ہے جو کبھی بنی اسرائیل کی تھی۔ (۲/۹۳)۔ ہم کتاب اللہ کو سنتے ہیں اور عمل اس کے خلاف کرتے ہیں۔ ہم دین کا عملی مفہوم ہی بھول گئے ہیں۔

قرآن کو سننا اور عمل اس کے خلاف کرنا

قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ دین کا عملی مفہوم ہے سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا (۲/۲۸۵)۔ احکامِ خداوندی کو اچھی طرح سنو، سمجھو اور اُن کے مطابق عمل کرو۔ یعنی ان کا سُننا اور سمجھنا اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بعد ان پر عمل کیا جا سکے۔ لیکن اگر کیفیت یہ ہو کہ آپ احکامِ الٰہی کے الفاظ سنتے رہیں اور اس کے بعد عمل اس کے خلاف کرتے رہیں تو اس کا جو نتیجہ ہوگا وہ ظاہر ہے۔ گویا انسانیت کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے تین شرائط لاینفک ہیں:

(۱) وحی کی رُو سے عطا شُدہ رہنمائی کی صداقت پر غور و فکر کے بعد یقین کرنا۔ (۲۵/۷۳)
(۲) پھر ان صداقتوں پر مبنی احکام کا اچھی طرح سمجھ لینا۔
(۳) اور سمجھنے کے بعد اُن کے مطابق عمل کرنا جیسا کہ رسولؐ اللہ نے کر کے دکھایا تھا (۴۴-۴۳/۴۳)۔

اب آپ اپنی حالت پر طائرانہ نگاہ ڈالئے۔ جس قدر ہم اللہ کی کتاب (القرآن) کو پڑھتے یا سنتے ہیں، اس کی مثال دنیا میں کہیں اور نہیں ملے گی اور اس کے بعد اپنی عملی زندگی میں ہم جس طرح اس کے خلاف چلتے ہیں اس کی مثال بھی دنیا میں کہیں اور نہیں ملے گی۔ ربّ العزت نے کہا تھا کہ کہو سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ــــ ہم نے سُنا اور ہم اس کے مطابق عمل کریں گے۔ ہم اس کے برعکس، زبانِ حال سے یہ کہتے ہیں سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا (۲/۹۳)۔ ہم نے سُنا، بہت اچھی طرح سے سُنا لیکن ہم عمل اس کے خلاف کریں گے۔ بالفاظِ دیگر ہم بھی اُسی روش پر چل نکلے ہیں جس پر ایک زمانے میں بنی اسرائیل تھے۔

سوچئے کہ کیا آج دنیا کا کوئی گوشہ ایسا بھی ہے جہاں سے اَطَعْنَا (ہم قرآنی احکام کی اطاعت کرتے ہیں) کی آواز بلند ہوتی ہو؟ اس کے برعکس، عَصَيْنَا (ہم اس کے خلاف کرتے ہیں) کے مظاہر ہر مقام پر نظر آئیں گے میکانکی طور پر کتاب اللہ کے الفاظ پڑھتے اور سنتے رہنا لیکن "گوسالہ" (۲/۹۳) کی عقیدت کو دل کی گہرائیوں میں

پیوست رکھنا، یہ ہے ہمارا مسلک و مشرب۔

اس مسلک کو پختہ تر کرنے کے لئے مذہبی پیشوائیت نے اس قسم کے عقائد وضع کر لئے ہیں کہ قرآنِ حکیم کے ایک ایک حرف پڑھنے سے دس دس نیکیاں مل جاتی ہیں۔ مثلاً الٓمٓ کہنے سے تیس نیکیوں کا ثواب مل جاتا ہے۔ مذہب کی تمام تگ و تاز کا منتہیٰ نیکیاں کمانا ہوتا ہے۔ اگر نیکیاں اس قدر آسان طریق سے مل جائیں تو کچھ اور کرنے کی ضرورت کیا رہ جاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے "ناظرہ" قرآن پڑھنے اور پڑھانے کے اہتمامات کئے جاتے ہیں۔ رمضان المبارک کے مہینے کے آخری تین دنوں میں "محفلِ شبینہ" منعقد کی جاتی ہیں جن میں قرآن طوفان میل کی رفتار سے پڑھا جاتا ہے تاکہ کوئی سمجھنے نہ پائے! یہ مذہبی پیشوائیت کی قرآنِ حکیم کے خلاف "سازش" نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کی صحیح تعلیم کو عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا جائے۔ اس میں ہمارے مذہبی پیشوا اس لئے کامیاب ہو جاتے ہیں کہ عوام کی اکثریت ان پڑھ ہوتی ہے ــ اور کتاب اللہ کے ساتھ محض ان کی عقیدت وابستہ ہوتی ہے۔ وہ اسے ریشمی غلافوں میں لپیٹ کر گھر میں کسی اونچی جگہ رکھتے ہیں۔ کھولتے ہیں تو اُسے چومتے ہیں۔ آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ اس کی طرف پیٹھ نہیں کرتے۔ اسے "ناظرہ" پڑھتے ہیں۔ اگر پڑھنا نہ آتا ہو تو قرآنی الفاظ پر انگلی پھیر کر ثواب حاصل کرتے ہیں! ان میں بعض ایسے ہوتے ہیں جو محض کتاب کے الفاظ دہراتے ہیں (جو انہوں نے حفظ کئے ہوتے ہیں) یہ جانے بغیر کہ ان الفاظ کے معانی اور مفہوم کیا ہے۔ ظاہر ہے جب عوام کی یہ حالت ہو تو ان کے مذہبی پیشوا، انہیں جو کچھ بتا دیں وہ اس کتاب کی تعلیم سمجھ لیں گے۔

اس صورتِ حال کا حل کیا ہے؟ اس کا جواب ہے، صحیح تعلیم اور ہمارے ہاں۔ ع

یہ ہے وہ لفظ جو شرمندۂ معنیٰ نہ ہوا

کہنے والے نے غلط نہیں کہا تھا کہ ع

دل بدل جاتے ہیں تعلیم بدل جانے سے

خود قرآن نے بھی نبیٔ اکرمؐ کا بنیادی فریضہ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ بتایا تھا۔ لہٰذا، اگر ہم نے مسلمان قوم کی حیثیت سے جینا ہے تو ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم قرآن کی صحیح تعلیم کو عام کر دیں۔ اسے پہلے خود سمجھیں بغیر کسی خارجی ملاوٹ کے اور پھر اسے دوسروں کو سمجھائیں لیکن قرآن کی تعلیم سے مراد وہ تعلیم نہیں جو ہمارے مذہبی مدارس میں "دینی علوم" کی شکل میں دی جاتی ہے اور جو طلباء کو قرآن سے بیگانہ ہی نہیں بنا دیتی، بلکہ اس پر ان کا ایمان بھی ختم کر دیتی ہے۔ قرآنی تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اسے حاصل کرنے کے بعد طالب علم اس قابل ہو جائے کہ "دنیا کا ہر دروازہ دین کی چابی سے کھول سکے"۔ ہزار افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ قوم کے بچوں کی تعلیم و

تربیت کی طرف ہم نے وہ توجہ نہیں دی جو نظریۂ پاکستان کا تقاضا تھا۔ اس مجرمانہ تغافل کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔

مجرمانہ تغافل

قوموں کا مستقبل ان کی ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جس قسم کے آج کے نوجوان، اُسی قسم کی کل کی قوم۔ اگر نوجوانوں کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر ہو جائے تو قوم خود بخود صحیح قالب میں ڈھل جائے گی۔ حصولِ پاکستان کے بعد سب سے مقدم کرنے کا کام یہ تھا کہ ہم اپنے بچوں کی تعلیم اس آئیڈیالوجی (نظریہ) کے مطابق کرتے جس کے تحفظ کے لئے ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا۔ ہم نے اس مقدس فریضہ سے مجرمانہ تغافل برتا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم آج اپنی قوم کی بے راہ روی کا اس قدر ماتم کر رہے ہیں۔

یہ سب قیامت خیزیاں اور ہنگامہ آرائیاں، جن میں سے ہم گذرے ہیں اور گزر رہے ہیں، اس لئے ہیں کہ ہم نے اپنی نسل کی تعلیم و تربیت کا صحیح انتظام نہ کیا۔ نہ ہی ہم نے ان راستوں کی نشاندہی کی جو انہیں اس منزل تک پہنچا دے جس کے لئے یہ خطۂ ارض حاصل کیا گیا تھا۔ ہاں البتہ نظریۂ پاکستان کے الفاظ اُٹھتے بیٹھتے دہراتے رہے اور بس۔ اگر کچھ کیا ہے تو یہ کہ مذہبی پیشوائیت نے "دینی علوم" کے لئے مکتب اور دار العلوم الگ قائم کر لئے اور حکومت نے دنیاوی تعلیم کے لئے اسکول اور کالج الگ قائم کر دئے اور شریعت کا منشا پورا کرنے کے لئے اسکول اور کالجوں میں ایک پیریڈ دینیات کا رکھ دیا۔ اہلِ تشیع کے لئے الگ اور سنیوں کے لئے الگ۔ اور پھر معاشرے میں فقدانِ وحدت اور عدم اتحاد کا رونا رونے لگ گئے۔ یہ ہے وہ منافقت جو ہمارے معاشرے کا اصل بگاڑ ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ دین اور دنیا میں ثنویت یکسر اسلام کے خلاف ہے۔ لیکن اب یہی ثنویت ہماری زندگی کا معمول بن چکی ہے۔ اسی طرح ہم جانتے ہیں کہ جہاں فرقہ بندی ہے وہاں توحید نہیں کیونکہ فرقہ بندی میں آخری سند کسی نہ کسی انسان کی قرار پا جاتی ہے، اللہ کی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود مذہبی پیشوائیت فرقہ پرستی کے شرک کو مٹانے کے لئے تیار نہیں۔ (۳۲-۳۰/۳۱)۔ گویا ہمارے مذہبی پیشوا اور ہم کتاب اللہ (القرآن) کے ایک حصے پر تو ایمان رکھتے ہیں اور دوسرے حصے سے انکار۔ یہ ہے مراد "اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ (۲/۸۵)" جس پر ہم کاربند ہیں اور ذلت و خواری کے اس عذاب میں ماخوذ جسے قرآن نے اس کا فطری نتیجہ بتایا ہے۔

قرآن کے ایک حصّے پر ایمان دوسرے سے انکار

اللہ کا دین، اسلام، ایک نظامِ حیات ہے جو پوری کی پوری انسانی زندگی کو محیط ہے۔ حیات (زندگی) کی صورت یہ ہے کہ وہ ناقابلِ تقسیم وحدت ہے جس کے حصّے بخرے نہیں کئے جا سکتے اور جب دین نظامِ حیات عطا کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ اسے بھی مختلف حصّوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اسے قبول کیا جائے گا تو پورے کا پورا اور مسترد کیا جائے گا تو پورے کا پورا۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ص وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ط اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ (۲/۲۰۸)

"اے جماعتِ مومنین! تم اس نظام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی مت کرو۔ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔"

اس کے معنی یہ ہیں کہ دین کے حصّے بخرے کر دینا شیطان کا اتباع ہے۔ کتاب اللہ کے بعض حصّوں کو قبول کر لینا اور بعض سے انکار کر دینا، کفر ہے، کھلا ہوا کفر اور اس کا نتیجہ اس دنیا میں ذلّت و خواری اور اخروی زندگی میں عذابِ الیم۔

غلط فہمی میں مبتلا ذہن یہ کہے گا کہ یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ جس نے دین کے جس حصّے سے انکار کیا اسے اُس حد تک تو مبتلائے عذاب ہونا چاہیئے۔ لیکن اُس نے اُس کے جس حصّے کو قبول کیا تھا، اُسے اس کا صلہ تو ملنا چاہیئے۔ یہ سوچ یکسر غلط ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ اگر آپ ڈاکٹر کے نسخے کو پورے کا پورا استعمال کریں گے تو وہ اپنا صحت بخش نتیجہ مرتب کرے گا، لیکن اگر آپ نسخے کے کچھ اجزا کو تو استعمال کریں اور کچھ کو چھوڑ دیں تو شفا حاصل ہونا تو ایک طرف، نہ معلوم اس سے آپ میں کتنے اور عوارض پیدا ہو جائیں۔ یہی کیفیت دین کے نظام کی ہے۔ یہ نظام اسی صورت میں اپنے خوشگوار نتائج پیدا کرے گا جب اسے بالکلیہ اختیار کیا جائے اور اگر اس کے بعض حصّوں کو اختیار کیا جائے اور بعض کو چھوڑ دیا جائے تو اس کا نتیجہ ذلّت و خواری کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ اس کی زندہ مثال ہماری اپنی حالت ہے۔

ہماری حالت کی مثالیں تو بہت سی دی جا سکتی ہیں لیکن جگہ کی کمی کی وجہ سے صرف ایک ہی پر اکتفا کروں گا۔ اس وقت (مذہب میں) ہماری حالت یہ ہے کہ ہم صدقہ اور خیرات کے متعلق آیات پر تو ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن "قُلِ الْعَفْوَ" (۲/۲۱۹) کے حکم سے کفر برتتے ہیں اور فریبِ نفس کے لئے اس کی طرح طرح کی تاویلیں کرتے رہتے ہیں۔ جس کے لئے ہمارے ہاں بکثرت وضعی روایات موجود ہیں۔ "عَفْوَ" قرآنی

معاشی نظام کا اصل الاصول ہے۔ عَفْوُ الْمَالَ اس مال کو کہتے ہیں جو کسی کے خرچ سے زائد ہو۔ قرآنِ حکیم میں آیا ہے کہ "یہ لوگ دریافت کرتے ہیں کہ ہم کس قدر مال و دولت نوعِ انسانی کی نشوونما کے لئے کھلی رکھیں اور کس قدر خود اپنے لئے رکھیں۔ اس کے جواب میں کہا کہ قُلِ الْعَفْوَ۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔" یعنی ہر فردِ معاشرہ پوری پوری محنت کرے اور اس کے بعد اپنی محنت کے ماحصل سے اپنے لئے صرف اس قدر لے جس سے اس کی بنیادی ضروریات پوری ہو جائیں باقی سب دوسروں کی ضروریات کے لئے قرآنی نظام کے حوالے کر دے۔ نظامِ سرمایہ داری کی اصل بنیاد فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) ہے۔ سرمایہ دار تو پھر بھی روپیہ لگا کر روپیہ حاصل کرتے ہیں مذہبی پیشوا بغیر روپیہ لگائے دوسروں کی کمائی بٹور لیتے ہیں۔ یہ سرمایہ داری کی شدید ترین شکل ہے۔ لہٰذا مذہبی پیشوائیت کی طرف سے قرآنی نظامِ معاشی کی مخالفت فطری امر ہے۔) قرآنی نظام میں فاضلہ دولت کسی فرد کے پاس رہنے نہیں پاتی۔ تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری نظام کے سر پر ہوتی ہے۔ اور افراد اپنی محنت کا ماحصل اس نظام کی تحویل میں دے دیتے ہیں۔ اس لئے نہ کوئی شخص بھوکا مرتا ہے اور نہ ہی کسی کے پاس زائد از ضرورت دولت رہتی ہے۔ یہ قرآنی معاشی نظام کی آخری شکل ہے۔ ظاہر ہے کہ دین کا نظام ایک دن میں قائم نہیں ہوگا۔ یہ بتدریج قائم ہوگا۔

دینی نظام کی تدریجی تکمیل

جب پہلی بار دین کا نظام قائم کیا جائے گا' (یعنی مذہب کے نظام کو چھوڑ کر دین کے نظام کی طرف آیا جائے گا، تو یہ راتوں رات قائم نہیں ہو جائے گا۔ یہ آہستہ آہستہ' بتدریج قائم ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ان تدریجی مراحل میں بعض اجزا دین کے ہوں گے اور بعض غیر اسلامی بھی ساتھ چلیں گے۔ جو قوم دین کا نظام قائم کرنے کے لئے اُٹھے اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اس نظام کی صداقت (کتاب اللہ) پر بالکلیہ ایمان رکھے۔ اس ایمان کے بعد وہ' غلط نظام کی جگہ تدریجاً صحیح نظام کی طرف بڑھتی جائے لیکن ہر مرحلہ میں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھے کہ یہ زندگی ہنوز اسلامی زندگی نہیں کہلا سکتی۔ ہم اسلامی زندگی کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔ وہ اسلامی اس وقت کہلائے گی جب دین کا نظام بالکلیہ قائم ہو جائے گا۔ اُس میں غریب اور امیر کے طبقات باقی نہیں رہیں گے۔ اس لئے امیروں کی طرف سے غریبوں کو صدقہ اور خیرات دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا لیکن ان تدریجی مراحل میں تو یہ تفریق موجود ہوگی۔ اگرچہ اس کی شدت رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی جائے گی۔

سردست سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ ہمارا موجودہ معاشی نظام غیر قرآنی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم

اس نظام کو قرآنی نظام سے بدلیں، چاہتے یہ ہیں کہ اس میں پیوند لگا کر اپنے آپ کو دھوکا دے لیں کہ یہ قرآنی ہو گیا ہے۔ لیکن وہ پیوند، اصل کے ساتھ فٹ نہیں بیٹھتا۔ اس کے لئے ہم کوشش یہ کرتے ہیں کہ اس میں کچھ کتر بیونت کر کے اسے کسی نہ کسی طرح اصل کے ساتھ چپکا دیں. لیکن یہ کوشش بھی کامیاب نہیں ہو سکتی. قرآنی نظام ایک غیر منقسم وحدت ہے. اس میں غیر قرآنی پیوند کبھی فٹ بیٹھ ہی نہیں سکتا، تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔

کرنے کا کام

ہمارے معاشی مسائل کے حل کا طریق یہ نہیں کہ کبھی ملکیتِ زمین کے سوال کو زیرِ بحث لے آئے اور کبھی سود اور بینک کاری پر گفتگو کرنے لگے. اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ سب سے پہلے:۔
یہ متعین کیا جائے کہ اسلام کا معاشی نظام ہے کیا. یہ کام ہمارے قدامت پرست مذہبی طبقہ کے بس کا نہیں. اس لئے کہ:۔

(۱) ان کے نزدیک وہ معاشی نظام جو عباسی ملوکیت کے زمانے میں مرتب ہوا تھا عین اسلامی نظام ہے.

(۲) ان کی ذہنیت یہ قرار پا چکی ہے کہ جو بات اسلام کے نام سے متعارف ہو کر چلی آ رہی ہے اس پر نظرِ ثانی نہیں کی جا سکتی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ

(۳) ان کے نزدیک قرآنِ حکیم دین میں واحد اور آخری سند نہیں۔

یہ کام اُن لوگوں کے کرنے کا ہے جو قرآنِ حکیم کو آخری حجت اور سند تسلیم کریں اور عصرِ حاضر کے اقتصادی تقاضوں پر ان کی نگاہ ہو.

جب اس طرح، پہلے یہ متعین ہو جائے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے تو اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ ہم اپنے موجودہ نظام سے اسلامی نظام تک کس طرح بتدریج پہنچ سکتے ہیں یعنی پہلے منزل کا تعین کر لیا جائے اور اس کے بعد اس تک بتدریج پہنچنے کے طریق و وسائل پر غور کر کے، چلنا شروع کر دیا جائے۔

خلاصۂ مبحث

عزیزانِ من! اسے ذہن میں رکھئے کہ ہماری منزل نزدیک ہوتے ہوئے بھی بہت دُور ہے. راستے میں مذہبی پیشوائیت نے جال بچھا رکھے ہیں. انہیں ہٹائے بغیر آپ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے (۹/۳۴). لیکن مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں ہے. مذہب ہمیشہ سے اللہ کے دین کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتا چلا آیا ہے۔ لیکن

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اپنی فریب کاریوں سے دین کو شکست دے سکتا ہے۔ دین، اللہ کے اٹل قوانین کا نام ہے اور ان قوانین کا آخرالامر غالب آنا خدائی پروگرام ہے (۹/۳۳)۔ اللہ کے اس پروگرام کو دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ حق آہستہ آہستہ باطل کے نظام پر غالب آتا ہے (۲۳/۵)۔ لیکن اگر ہم اللہ کے عطا کردہ قوانین و احکام کو اپنی زندگی میں عملاً رائج کر لیں تو یہ رفتار تیز ہو سکتی ہے محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ انہوں نے اپنے یقینِ محکم اور عملِ پیہم سے چند سالوں میں ایسا کر دکھایا تھا۔ یہی ہمیں کرنا ہوگا۔ ہمارے پاس بھی تو وہی اللہ کی کتاب ہے جو صدرِ اوّل کی جماعتِ مومنین کے پاس تھی۔ سوچیئے! ہماری موجودہ ابتر حالت کا سبب کیا ہے؟ ؎

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں (اقبالؒ)

اُٹھئے اور اربابِ سیاست اور مذہبی پیشوائیت کے علمبرداروں کو بتایئے کہ ہم نے پاکستان "مذہبی آزادی" کے لئے نہیں "دین کی آزادی" کے لئے حاصل کیا تھا اور دین کی یہ آزادی اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی ؎

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے دُرد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو، میرے پیمانے کا ہے!

وقت کی اہم ضرورت ہے کہ مذہبی پیشوائیت کے عزائم کو سمجھا جائے تاکہ انہیں دین و مذہب کی موجودہ "جنگ" میں شکست دی جا سکے اور انہیں بتایا جا سکے کہ ؎

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گُل کے نکھار کا موسم

ہمارے پاس اللہ کی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ ہم جس وقت بھی چاہیں ــــ بشرطیکہ ہم چاہیں ــــ اپنے مروّجہ مذہب کو دین الحق سے بدل سکتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسا کرنے کے لئے بڑی کاوش درکار ہوگی۔ بڑی جستجو کرنی ہوگی۔ بغیر جستجو کے کچھ حاصل بھی تو نہیں ہو سکتا۔ بقول شاعر ؎

ایسا مشکل نہیں ترا ملنا
دل مگر جستجو کرے کچھ تو (ناصر کاظمی)

حقائق و عبر

۱۔ نظریۂ ضرورت

انشورنس کے حق میں شرعی دلائل دیتے ہوئے ہفت روزہ الاعتصام بابت ۸ مئی ۱۹۹۲ء کے فاضل مضمون نگار رقمطراز ہیں کہ

"شریعت کا ایک بہت بڑا اصول یُسر اور رفع حرج ہے۔

یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (بقرہ ۱۸۵)

"اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا۔"

وما جعل علیکم فی الدین من حرج (حج ۷۸)

"اور اُس نے تمہارے لئے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی"

اس بنا پر علماء کہتے ہیں:

اذا ضاق الامر اتسع۔

جب معاملہ تنگ ہوجاتا ہے تو گنجائش بھی نکل آتی ہے۔

المشقۃ تجلب الیسیر

"مشقت آسانی لاتی ہے"

الضرورات تبیح المحظورات۔

"ضرورتیں ممنوعات کو جائز قرار دیتی ہیں"

وما حرم لذاتہ یباح للضرورۃ۔

"جو چیزیں فی نفسہ حرام ہیں وہ مجبوری کی صورت میں جائز ہوجاتی ہیں"

وَ ما حرم لسد الذریعة یباح للحاجة۔

"جو چیزیں سدِ ذریعہ کے طور پر حرام ہیں وہ حاجت کے لئے جائز ہو جاتی ہیں"

طلوعِ اسلام :۔ اس نسخۂ کیمیا کی موجودگی میں سود کو حلال قرار دینے میں کیا مشکل رہ جاتی ہے ؟

۲۔ کشمیر میں خونِ مسلم کی ارزانی

مقبوضہ کشمیر میں بھارتی سورماؤں کے مظالم پر تحفظِ حقوقِ انسانی سرینگر کی سال ۱۹۹۱ء کی جو رپورٹ جو حرکت الجہادِ الاسلامی آلِ جموں و کشمیر نے حال ہی میں شائع کی ہے۔

۱۹۹۱ء	شہید کر دیئے گئے	گرفتار کئے گئے	عورتوں کی عصمت دری	گھروں کو جلایا گیا	اذیت دیکر شہید کیا گیا	معذور/زخمی کئے گئے	اغوا، گمشدگی	کرفیو کے دن
جنوری	۸۰۰	۲۰۵۰	۲۳	۲۶۸	۱۶	۲۱۰۷	۲۱۱	۱۲
فروری	۸۹۱	۱۹۷۰	۸۵	۳۴۲	۲۲	۱۹۰۶	۳۰۱	۷
مارچ	۴۲۱	۲۰۴۰	۲۷	۲۶۱	۳۱	۲۴۱۱	۳۴۱	۱۵
اپریل	۶۴۵	۲۶۴۲	۲۹	۴۱۱	۱۳	۲۱۲۴	۱۰۳	۹
مئی	۷۳۱	۱۹۴۱	۲۳	۶۵۱	۱۷	۱۹۱۸	۵۱۳	۱۱
جون	۵۴۷	۲۰۹۲	۲۱	۲۴۰	۲۱	۱۸۲۳	۳۲۰	۱۰
جولائی	۶۹۵	۱۸۳۱	۱۹	۶۴۱	۲۷	۱۷۲۹	۴۰۷	۱۵
اگست	۷۱۱	۹۴۱	۱۶	۹۲۷	۱۹	۱۷۹۲	۱۲۹	۱۳
ستمبر	۵۴۱	۱۷۰۹	۲۲	۵۲۳	۲۷	۲۱۷۱	۸۸	۹
اکتوبر	۴۰۷	۱۹۰۲	۲۶	۸۶۹	۱۷	۱۴۳۲	۱۰۲	۷
نومبر	۷۹۲	۲۵۱۰	۲۹	۸۱۱	۲۶	۱۸۱۱	۸۶۶	۱۲
دسمبر	۹۰۲	۲۷۰۸	۲۸	۷۶۹	۲۹	۲۳۴۳	۱۰۷۰	۱۶
ٹوٹل	۸۰۸۳	۲۴۳۳۶	۳۴۸	۶۷۱۳	۲۶۵	۲۳۵۶۷	۴۴۵۰	۱۳۶

راستی توصیف

ایک سوال

صاحبِ صدر اور حاضرین السلام علیکم

میں پچھلے سال بھی مذاکرے میں شریک تھی، مجھے اس سے بڑی خوشی ہوئی تھی، آپ نے بھی میری ہمت بندھائی تھی۔ اس بار آپ نے عنوان ہی ایسا رکھا ہے کہ میرے جیسوں کو سمجھ ہی نہیں آسکتا۔ اس لئے میں عنوان پر کچھ کہنے کے لئے نہیں آئی۔ آپ سے کچھ پوچھنے، کچھ سمجھنے آئی ہوں۔ آپ ضرور سمجھا سکیں گے۔ جب میں نے عنوان کا مطلب پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو آپس میں گھل مل کر اتفاق سے رہنے اور بہتر زندگی گزارنے کا پیغام ہے۔ میرے پاس دنیا کا ایک نقشہ ہے۔ اس میں پاکستان کو بہت کم جگہ ملی ہوئی ہے۔ اس میں میں نے لاہور دیکھا۔ ویسے بھی لاہور کی رہنے والی ہوں، یہیں پیدا ہوئی ــــ بخارا اور سمرقند ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی۔ سوویت روس میں یہ نظر آئے ــــ اس نقشے میں دنیا کے بیچوں بیچ ایک سبز پٹی نظر آتی تھی، یہ مراکو، لیبیا، مصر، ترکی، عراق، شام، ایران، پاکستان اور افغانستان تک پھیلی ہوئی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ سب مسلمان ملک ہیں، دنیا کے نقشے میں سب ساتھ ساتھ ہیں۔ جیسے کندھے سے کندھا جوڑ کر کھڑے ہوں۔ مگر کیا ان سب میں اتفاق ہے۔ یہ ایک دوسرے کے ہمدرد، دوست ساتھی ہیں؟ مجھے زیادہ علم تو نہیں، ایران، عراق کی جنگ، افغانستان میں مسلمانوں کی آپس میں لڑائی کا کچھ پتہ ہے۔ بخارا اور سمرقند سبز پٹی میں نہیں ــــ شاید ان کے ساتھ آنے کی خوشی ہی یہ ولولہ اور جوش پیدا کرتی ہے، شاید کل یہ بھی سبز رو میں شامل ہو جائینگے مگر اس سے فرق کیا پڑے گا۔ پہلے سے ساتھ جڑے ہوئے ملکوں کے دل آپس میں کیوں جڑ نہیں سکے۔ نئے ملکوں کے ساتھ ملنے سے کیسے جڑ جائیں گے۔

میرے بزرگو! مجھے یہ بات سمجھا سکیں تو سمجھائیں آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔

(راستی توصیف)

بچّوں کا صفحہ

اسلامی معاشرت

علّامہ غلام احمد پرویزؒ

اسلامی معاشرہ کیسے قائم ہوتا ہے

۵

دنیا میں امن اور سلامتی قائم رکھنے اور تمام لوگوں کی پرورش اور تربیت کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی معاشرہ قائم کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اسلامی معاشرہ وہ ہوگا جس میں تمام لوگ خدا کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں اور کوئی بات اُن قوانین کے خلاف نہ ہو۔

آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ وہ قوانین ہمیں کہاں سے ملیں گے؟ اس کا جواب واضح ہے۔ یہ قوانین، اللہ تعالےٰ نے ہمارے رسولِ کریم (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو وحی کے ذریعے دیئے تھے اور اب وہ، سب کے سب، قرآنِ شریف کے اندر محفوظ ہیں۔ انہی قوانین کو قرآن شریف کے احکام بھی کہتے ہیں۔ (احکام حُکم کی جمع ہے) جس معاشرہ میں خُدا کے احکام کے مطابق زندگی بسر ہوتی ہو اُسے اسلامی حکومت کہتے ہیں۔ قرآن شریف میں ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۵/۴۴)

جو لوگ خُدا کے حکموں (قرآن شریف) کے مطابق اپنے معاملات کا فیصلہ نہیں کرتے، وہ کافر ہیں۔

یعنی مومن اور کافر میں فرق یہ ہے کہ مومن قرآن شریف کے احکام کو مانتے اور ان کے مطابق کام کرتے ہیں اور کافر ان احکام کو نہیں مانتے۔

(یاد رکھو! کافر کا لفظ گالی نہیں اس کے معنی ہیں قرآن شریف کے حکموں کو نہ ماننے والا)۔

پیارے بچّو! جب تم بڑے ہو گے تو قرآن شریف کے بڑے بڑے احکام تمہارے سامنے آئیں گے۔ اس کتاب میں اس قسم کے چھوٹے چھوٹے احکام بیان کئے جاتے ہیں جن کا تعلّق ہماری روزمرّہ کی زندگی سے ہے انہیں بڑے غور سے پڑھو۔ اچھی طرح سمجھو اور پھر ان کے مطابق کام کرو۔ یاد رکھو! فائدہ اُسی بات سے ہوتا ہے جس پر عمل کیا جائے۔ جس بات کو سمجھ تو لیا جائے لیکن اس پر عمل نہ کیا جائے اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر تمہیں اچھی طرح سے معلوم ہو جائے کہ ورزش کرنے سے صحت ٹھیک رہتی ہے۔ لیکن تم ورزش کرو نہیں، تو تمہاری صحت ٹھیک نہیں رہ سکتی۔ صحت اسی کی ٹھیک رہے گی جو ورزش کرے گا۔ خدا کے احکام کو سمجھنے کا فائدہ اسی کو ہوگا جو اُن پر عمل کرے گا۔

فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی

بہا میری نوا کی

ہے ساقی!

(اقبالؒ)

علامہ غلام احمد پرویزؒ کی قرآنی فکر اپنے ہی افکار و خیالات کی روشنی میں۔

مرتبہ

محمد عمر دراز

النور پرنٹرز و پبلشرز، ۳/۲ فیصل نگر، ملتان روڈ لاہور

نصابِ زکوٰۃ میں تبدیلیاں

(مختلف ادوارِ خلافت میں)

جیساکہ آپ کو معلوم ہے طلوعِ اسلام کا مسلک یہ ہے کہ

(۱) قرآنی اصولوں کی جو جزئیات نبی اکرمؐ نے متعین فرمائی تھیں اگر ان میں کسی زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق کسی تبدیلی کی ضرورت ہو تو وہ تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ لیکن

(۲) یہ تبدیلی صرف وہ اسلام کر سکتا ہے جو علیٰ منہاجِ نبوت، قرآنی حکومت کے قیام کے لئے وجود میں آئے۔ ہمیں یا آپ میں سے کسی فرد کو اس تبدیلی کا حق نہیں ہے اور

(۳) جب تک ایسا نظام قائم نہ ہو اور وہ ایسی تبدیلی نہ کر دے اس وقت تک ان احکام میں کوئی ردّ و بدل نہیں کرنا چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ طلوعِ اسلام جس تبدیلی کے جواز کا قائل ہے اس سے زیادہ تر ہمارے معاشی اور معاشرتی حالات ہی متاثر ہونگے کیونکہ زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کا زیادہ تر اثر انہی پر پڑے گا۔ مثلاً زکوٰۃ کی شرح اور نصاب رسول اللہ کے عہد مبارک میں اڑھائی فیصدی مقرر کی گئی تھی۔ اگر وہ نظام جو علیٰ منہاجِ نبوت قائم ہو، دیکھے کہ اس شرح یا نصاب سے ہمارے زمانے میں کام نہیں چل سکتا تو وہ اس میں تبدیلی کر سکتا ہے۔ مگر طلوعِ اسلام کا یہ جرم اتنا بڑا جرم سمجھا گیا کہ اسے آئے دن مطعون کیا جاتا رہتا ہے کوئی اسے منکرِ حدیث کہتا ہے اور کوئی اسے منکرِ رسالت۔ حالانکہ طلوعِ اسلام نہ منکرِ حدیث ہے نہ منکرِ رسالت۔ وہ صرف اس چیز کا مطالبہ کرتا ہے جو خود رسول اللہ کی حیاتِ طیبہ اور خلفائے راشدینؓ کے دورِ حکومت میں ہوتا چلا آیا ہے بدلے ہوئے حالات میں خود عہد برکت مہد میں بھی اس قسم کی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔

زکوٰۃ کا نصاب یعنی سات تولہ سونا اور ساڑھے باون تولہ چاندی ایک ایسا مقررہ نصاب مانا جاتا ہے جس میں کسی تبدیلی کا تصور تک بھی گوارہ نہیں کیا جاتا۔

آج کی فرصت میں ہم محترم محمد ابو العلا البنا مدرس فلکیات کلیہ شریعت مصر کے ایک مضمون کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں جو مجلہ الازہر بابت ماہ شوال ۱۳۷۶ھ میں شائع ہوا تھا۔ موصوف نے اس مضمون میں خاص علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے بحث

کر کے بتایا ہے کہ ہمارے ہاں زکوٰۃ کے نصاب میں مختلف ادوار میں کیا کیا تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور آج جو نصاب ہمارے ہاں رائج ہے وہ دراصل جناب رسول اللہ صلعم کا متعین فرمودہ نہیں بلکہ حجاج بن یوسف ثقفی گورنر عراق کے مشورہ سے خلیفہ اموی عبدالملک کا متعین کردہ نصاب ہے۔ (طلوعِ اسلام)

مجلّہ "الازہر" کے رجب کے پرچہ میں ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ اسلام سے پہلے عربوں میں کون کون سے اوزان، سکے اور پیمانے رائج اور مستعمل تھے۔ وہاں ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ یہ تمام اوزان، سکّے اور پیمانے مختلف حکومتوں مصر شام اور ایران کے بنائے ہوئے تھے۔ عرب کی حکومتوں نے انہیں نہیں بنایا تھا۔ اسلام آیا، تو اس نے عربوں کے لئے ان کے استعمال کو برقرار رکھا جیسا کہ اس نے ہر قوم کے لئے اس کے عرف کو برقرار رکھا تھا۔ لیکن یہ برقراری قطعًا نہیں تھی، بلکہ صرف لوگوں کے باہمی معاملات تک ہی محدود تھی۔

جہاں تک حقوق اللہ کا تعلق ہے۔ مثلاً نصاب ہائے زکوٰۃ، دیات، کفّارات، تو شارع نے ان کی وصولی کے لئے پیمانوں میں اہلِ مدینہ کے عرف کو اور نقود اور اوزان میں اہلِ مکّہ کے عرف کو معیار تسلیم کیا ہے۔

ہم نے اس سلسلہ میں کلام کرتے ہوئے گرام کے وزن کو بنیاد قرار دیا ہے جو آج ساری دنیا میں معروف ہے۔ گرام جو صاف پانی کے مکعب سنٹی میٹر کے وزن کے مساوی ہو ــــ تاکہ ان شرعی اندازوں کو جس وزن یا جس سکّہ یا جس پیمانہ میں سہولت کے ساتھ منتقل کیا جا سکے خواہ وہ کسی حکومت کا بھی کیوں نہ ہو کہ پانی کا وزن اور حجم کسی زمانہ اور کسی مقام پر مختلف نہیں ہوتا برخلاف گیہوں، جو، مسور یا رائی کے دانوں کے کہ وہ نہ صحیح طور پر وزن کو محفوظ کر سکتے ہیں نہ حجم کو۔

اب ہم ان اوزان، سکّوں اور پیمانوں کو بیان کریں گے جو رسول اللہ صلعم کی حیاتِ طیبہ اور خلفائے راشدینؓ کے عہدِ خلافت میں معاملاتِ شرعیہ کے اندازوں کے لئے اختیار کئے جاتے تھے اور امیر المؤمنین عمرؓ بن خطاب اور امیر معاویہؓ اور عبدالملک کے عہدِ خلافت میں جو کمی بیشی کی گئی اور جس پر ائمہ اربعہ کی رائے قائم ہو گئی اور جس پر آج تک یعنی ۱۴ھ تک برابر عمل ہوتا آ رہا ہے۔

محدثین، مؤرخین اور فقہاء کی تمام روایتیں اس امر پر متفق ہیں کہ چاندی کا نصاب جس میں زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے ان مشہور ترین درہموں سے شمار کر کے پورا کیا جائے گا جو نبوت کے عہد میں اور حضرت ابوبکرؓ صدیق کے عہد میں زیادہ تر مستعمل تھے۔ ساتھ ہی تمام روایات اس امر پر بھی متفق ہیں کہ اس عہد میں مشہور ترین درہمی سکّے دو قسم کے تھے، ایک چھوٹا درہم ہوتا تھا (جس کا وزن چار دانق ہوا کرتا تھا) اور دوسرا بڑا درہم تھا (جس کا وزن آٹھ دانق ہوا کرتا تھا) اگرچہ بعض روایتوں میں ایک تیسری قسم کا درہم بھی بیان ہوا ہے جس کا وزن چھ دانق ہوتا تھا۔ مگر یہ کوئی بڑا اختلاف نہیں کیونکہ چھ دانق والا درہم دونوں گذشتہ درہموں کے درمیانی وزن کا درہم ہے اور گذشتہ دونوں درہموں سے زیادہ شہرت رکھتا تھا۔

اس کے بعد جن امور میں روایات واقعی طور پر مختلف ہوئی ہیں، وہ امور یہ ہیں:۔

۱۔ نصابِ زکوٰۃ (یعنی دو سو درہم) کیا صرف چھوٹے درہم سے کیا جاتا تھا یا محض بڑے درہم سے شمار کیا جاتا تھا اور کیا اس کا انحصار زکوٰۃ وصول کنندگان کی صوابدید پر ہوا کرتا تھا؟

۲۔ یا دونوں قسم کے درہموں سے شمار کی جاتی تھی کہ آدھے چھوٹے درہم شمار کئے جاتے ہوں اور آدھے بڑے درہم یا تینوں قسم کے درہموں سے شمار کی جاتی تھی کہ ایک تہائی چھوٹے درہم، ایک تہائی درمیانی درہم اور ایک تہائی بڑے درہم شمار کر لئے جاتے ہوں۔

ان سوالات کا جواب (جس کے علاوہ کوئی دوسرا جواب صحیح بھی نہیں ہو سکتا) یہ ہے کہ روایات میں دونوں طریقے موجود ہیں کہ وہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے آخری عہد تک معمول بہا تھے اور اس کا انحصار وصول کنندگان کی صوابدید پر ہوا کرتا تھا۔ کسی صحیح روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ ان دراہم میں سے کوئی سا ایک درہم عملِ زکوٰۃ میں مخصوص تھا تاآنکہ حضرت عمرؓ نے اپنے آخری عہد میں صرف دوسرے طریقہ پر عمل کرنے کو متعین کر دیا جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے درمیانی درہم کو نصابِ زکوٰۃ یعنی دو سو درہم کو شمار کرنے کا معیار قرار دے دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زکوٰۃ کے درہم کا وزن حضرت عمرؓ کی آخری خلافت اور حضرت عثمانؓ کی تمام مدتِ خلافت میں چھ دانق یعنی (۸۳۲ گرام) تھا۔ جیسا کہ روایات اور مختلف عجائب خانوں کے پرانے قدیم سکوں کے دیکھنے سے ہوتا ہے۔ یہ وزن ہم نے اس لئے متعین کیا ہے کہ روایات میں دانق سے مراد پرانا رومانی دانق ہوتا ہے جس کا وزن (۴۷۲ گرام) ہوتا تھا اس بنا پر ان تینوں درہم کا وزن حسبِ ذیل ہوتا تھا۔

۴۷۲ × ۸	۳،۷۷۶ گرام
۴۷۲ × ۴	۱،۸۸۸ گرام
۴۷۲ × ۶	۲،۸۳۲ گرام

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ انہوں نے زکوٰۃ کی وصولی کے لئے ان تینوں مروّجہ درہموں میں سے درمیانی وزن کے درہم کو عملی یکسانیت پیدا کرنے کے لئے معیار قرار دے دیا تھا یعنی آخری درہم کو جو چھ دانق کا ہوا کرتا تھا۔ رسول اللہ صلعم نے اپنی زندگی میں اس کی تعیین وصول کنندگانِ زکوٰۃ کی صوابدید پر چھوڑ رکھی تھی۔ لہٰذا یہ تصرف رسول اللہ صلعم کے طرزِ عمل کے خلاف نہیں کہا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے صدقات کے مطلق امر کو ایک متعین صورت میں منحصر کر دیا۔

آئندہ نقشہ سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ زمانۂ تشریع میں مشہور درہمی سکے کون سے تھے جو شرعی معاملات کا اندازہ کرنے کے لئے اختیار کئے جاتے ہوں۔ ایسے ہی وہ وحدتیں کون کون سی تھیں جن سے یہ سکے مرکب ہوتے تھے۔ اس نقشہ میں ہم نے خلفائے راشدینؓ کے آخری عہد تک کے سکوں کے اوزان دیئے ہیں اور سب سکوں کے اوزان گرام

کے مطابق دیئے گئے ہیں

سکہ جاتی مشہور درہم اوران کی وحدتیں جو آخری عہد خلفائے راشدین تک عربوں میں رائج تھیں										
سکوں کے نام اور اوزان	گراموں میں وزن	نسبتیں								
		حبہ عبری قدیم	حبہ رومانی قدیم	حبہ عبری جدید	قیراط رومانی قدیم	قیراط رومانی جدید	دانق رومانی قدیم	درہم طبری عتیق	درہم طبری نیروتی	نقلی درہم صغیر
درہم نقلی صغیر	۳٫۷۷۶	۸۵ ۱/۳	۸۰	۶۴	۲۰	۱۹٫۲	۸	۲	۱ ۱/۳	۱
درہم طبری نیروتی	۲٫۸۳۲	۶۴	۶۰	۴۸	۱۵	۱۴٫۴	۶	۱ ۱/۲	۱	
درہم طبری عتیق	۱٫۸۸۸	۴۲ ۲/۳	۴۰	۳۲	۱۰	۹٫۶	۴	۱		
دانق رومانی قدیم	۰٫۴۷۲	۱۰ ۲/۳	۱۰	۸	۲ ۱/۵	۲٫۴	۱			
قیراط رومانی جدید	۰٫۱۹۶۷	۴ ۴/۹	۴ ۱/۴	۳ ۱/۳	۱ ۱/۲۴	۱				
قیراط رومانی قدیم	۰٫۱۸۸۸	۴ ۴/۱۰	۴	۳ ۱/۵	۱					
حبہ عبری جدید	۰٫۰۵۹	۱ ۱/۳	۱ ۱/۴	۱						
حبہ رومانی قدیم	۰٫۰۴۷۲	۱ ۱/۱۵	۱							
حبہ عبری قدیم	۰٫۰۴۴۲۵	۱								

پھر امیر معاویہؓ کے عہد خلافت میں زیاد نے ان کو مشورہ دیا کہ درہم کے وزن میں زیادتی کر دی جائے۔ چنانچہ اس نے درہم میں (۲٫۸۵ گرام) تک زیادتی کر دی۔ زیاد کا مشورہ امیر معاویہ کو یہ بھی تھا کہ ایک درہم کو چھ دانق کا کر دیں اور ہر دانق (۰٫۴۹۲ گرام) کا کر دیا جائے۔ یہ نئے رومانی دانق کا وزن تھا۔ چنانچہ زیاد نے کوفہ میں ایک درہم بنوایا جو حضرت عمرؓ کے درہم کے ۲۵/۲۴ کی نسبت سے برابر تھا۔ چنانچہ اس کا وزن $\frac{۲۵ \times ۲٫۸۳۲}{۲۴}$ = ۲٫۹۵۰ گرام تھا۔

پھر عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں حجاج نے اس کو مشورہ دیا کہ وہ زیاد کے عمول کو برقرار رکھے۔ چنانچہ اس نے درہم کا وزن (۶ × ۰٫۴۹۲) = ۲٫۹۵۲ گرام قرار دے دیا جبکہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ۲٫۸۳۲ × ۲ = ۵٫۶۶۴ گرام ہوتا تھا اور امیر معاویہؓ کے زمانہ میں (۲٫۸۵ × ۲ = ۵٫۷۰ گرام تھا۔

پھر عبدالملک نے سختی کے ساتھ یہ حکم نافذ کر دیا کہ لوگ باہمی معاملات میں اس وزن کی پیروی کریں جو اس نے مقرر کر دیا ہے اور پورے اموی اور عباسی دورِ خلافت میں برابر اس کے مطابق عمل ہوتا رہا۔ چنانچہ فقہ کے چاروں اماموں نے بھی اسی سے اتفاق کیا ہے اور اسی کے مطابق آج تک عمل ہوتا چلا آرہا ہے۔

سب سے اہم ترین چیز جو ہمیشہ پیشِ نظر رہنی چاہیئے یہ ہے کہ اوزان کی وہ وحدتیں جو عربوں میں خلفائے راشدینؓ کے آخری زمانہ تک رائج اور مستعمل تھیں، وہ قدیم رومانی نظام کی وحدتیں تھیں لیکن بنوامیہ نے اپنے دور میں جن وحدتوں کو استعمال کیا ہے، وہ رومی جدید اور رومی قدیم دونوں وحدتوں کے اختلاط سے پیدا ہوئی تھیں، نیز ان وحدتوں سے پیدا ہوئی تھیں جنہیں انہوں نے نظام جدید سے حاصل کیا تھا۔ مندرجہ ذیل دونوں نقشوں سے یہ بات ذہن نشین ہو سکے گی۔

(رومی نظام قدیم)

اوزان اور سکوں کے نام	گرام میں وزن	حبّہ میں وزن
مثقال دینار	۴٫۲۴۸ - ۴٫۷۲	۹۰ - ۱۰۰
درہم بغلی، درہم طبری	۲٫۸۳۲ - ۳٫۷۷۶	۶۰ - ۸۰
درہم عتیق، دانق	۰٫۴۷۲ - ۱٫۸۸۸	۱۰ - ۴۰
قیراط حبّہ	۰٫۴۷۲ - ۰٫۱۸۸۸	۴

نظام بنوامیہ

اوزان اور سکوں کے نام	گرام میں وزن	حبّہ میں وزن
مثقال و دینار درہم عبدالملک	۴٫۲۲ ۲٫۹۵۴	۸۵ ۵/۷ ۶۰
دانق زیاد قیراط عبدالملک	۰٫۴۹۲ ۰٫۲۱۱	۱۰ ۸٫۵۵
قیراط رومانی جدید	۰٫۱۹۶۷	۴
حبہ رومانی جدید	۰٫۴۹۲	۱

چنانچہ امیر معاویہؓ کے عہد میں زیاد نے زکوٰۃ کے لئے ایک درہم بنالیا تھا جو رومی جدید نظام کے تحت بنایا گیا تھا کیونکہ اس کا ایک حبّہ (۰٫۴۹۲ گرام) کے مساوی تھا۔ زیاد نے اس سے (۶۰ حبہ) کا درہم بنایا، جیساکہ حضرت عمرؓ کا مشہور درہم رومی قدیم حبّہ کے وزن سے (۶۰ حبہ) کا ہوتا تھا، لیکن امیر معاویہؓ نے زیاد کی بات نہیں مانی، لیکن حجاج نے اس مشورہ سے عبدالملک کو مطمئن کر دیا۔ چنانچہ ان دونوں نے اس کو نافذ کر دیا۔ جیساکہ زکوٰۃ کا دینار نبوت اور خلفائے راشدینؓ کے عہد میں (۴٫۲۵ گرام) تھا مگر ان دونوں نے اس کو کم کر کے (۴٫۲۲ گرام) کر دیا تھا۔ پھر اس کو دس قیراط میں انہوں نے تقسیم کر دیا اور ہر قیراط (۰٫۲۱۱ گرام) کا کر دیا۔ پھر اس دینار کے وزن کو سکوں کے وزن کا معیار قرار دے دیا۔ چنانچہ اسے دونوں ناموں سے پکارتے تھے۔ اسے مثقال بھی کہتے تھے اور دینار بھی کہتے تھے۔ اسی طرح بنوامیہ کا نظام سکہ رومانی قسطنطینی قاعدہ کے بالکل مطابق ہوگیا۔

(یعنی ہر دس درہم سات مثقال کے برابر ہوگئے۔ یہ دونوں یعنی مثقال اور درہم جو حجاج نے بنوائے اس رطل کے لئے وحدت بھی تھے جو بعد میں رطل بغدادی کے نام سے مشہور ہوا۔ چونکہ اس مثقال کا وزن (۴٫۵۳۱ گرام) تھا، تو درہم کا وزن اسی کے مطابق (۳٫۱۷۱ گرام) تھا مگر یہ دونوں درہم اور مثقال وزن اور ناپ تول کے لئے، سکہ کی حیثیت سے مستعمل نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سکہ کی حیثیت سے یہ دونوں کبھی نہیں بنائے گئے۔

پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ سونے کے نصاب پر دو اندازے جاری رہے ہیں (پہلا اندازہ) تو یہ تھا کہ اس کا زمانۂ نبوت اور عہدِ خلفائے راشدین میں (۲۰ × ۴٫۲۵ = ۸۵ گرام) تھا۔ (دوسرا اندازہ) یہ تھا کہ اس کا وزن زکوٰۃ کے درہم کو کم کر دینے کے بعد (۲۰ × ۴٫۲۲ = ۸۴٫۴ گرام) ہو گیا۔ یہ اندازہ عبدالملک کے عہد سے لے کر تمام بعد کے خلفاء کے عہد میں رہا اور اسی کو ائمہ

اربعہ نے تسلیم کرلیا

لیکن چاندی کے نصاب میں مختلف ادوار میں چار اندازے جاری رہے۔

پہلا اندازہ

زمانۂ نبوت اور عہدِ خلافت ابوبکرؓ اور ابتداء عہدِ خلافت عمرؓ وصول کنندگانِ زکوٰۃ کو اختیار ہوتا تھا کہ وہ دونوں طریقوں پر زکوٰۃ کا نصاب شمار کرسکتے ہیں۔ (پہلا طریقہ) ان کو یہ بھی اختیار تھا کہ وہ تمام دو سو کے دوسو درہم تینوں مشہور درہموں میں سے کسی ایک درہم سے شمار کریں (ملاحظہ ہو نقشہ) ــ (دوسرا طریقہ) ان کو یہ بھی اختیار تھا کہ تیسرے درہم کو (یعنی نقشہ میں درہم ۳ کو) نصاب کے شمار کرنے میں معیار قرار دیں۔ یعنی اس طریقہ پر نصاب شمار کریں کہ وہ ہمیشہ (۵۶۶٫۴ گرام) کے وزن کے برابر ہو۔ یعنی پہلی قسم کے درہم سے نصاب شمار کریں، تو ۱۵۰ درہم شمار کریں اور دوسری قسم کے درہم سے (۳۰۰ درہم) شمار کریں اور تیسری قسم کے درہم سے (۲۰۰ درہم) شمار کریں۔

نمبر	عدد دراہم نصاب	درہم کا وزن گرام میں	نصاب کا وزن گرام میں
۱	۲۰۰	۳٫۷۷۶	۷۵۵٫۲
۲	۲۰۰	۱٫۸۸۸	۳۷۷٫۶
۳	۲۰۰	۲٫۸۳۲	۵۶۶٫۴

دوسرا اندازہ

چاندی کے نصاب کے لئے دوسرا اندازہ حضرت عمرؓ کی آخری خلافت کے زمانہ میں ہوا جبکہ انہوں نے یہ حکم دے دیا کہ زکوٰۃ کی وصولیابی میں صرف دوسری ہی صورت پر عمل کیا جائے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ تیسرا درہم جس کا وزن (۲٫۸۳۲ گرام) تھا وہ زیادہ تر مستعمل تھا اور اس کا وزن بھی اوّل اور دوم نمبر کے درہموں کے درمیان تھا۔ یعنی مختلف روایات کے مطابق ۳٫۷۷۶ × ۱٫۸۸۸ / ۲ = ۲٫۸۳۲ گرام تھا۔ یا ۳٫۷۷۶ × ۱٫۸۸۸ / ۳ ۱٫۸۳۲ = ۲٫۸۳۲ گرام تھا۔ حضرت عمرؓ نے عمل میں یکسانیت پیدا کرنے کی خاطر نصابِ زکوٰۃ اور باقی تمام شرعی معاملات کے لئے اس تیسرے نمبر کے درہم کو معیار قرار دے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس تیسرے نمبر کے درہم کا نام ہی درہم عمر پڑ گیا۔

تیسرا اندازہ

امیر معاویہؓ کی خلافت میں جب یہ درہم زیاد کے مشورہ سے (۲٫۸۵) گرام تک بڑھ گیا جس کی تفصیل پہلے آچکی ہے، تو نصاب یوں ہوگیا۔

(۲۰۰ در ۲٫۸۵ = ۵۷۰ گرام)

چوتھا اندازہ

عبدالملک کے دورِ خلافت میں بھی جب کہ درہم (۲،۹۵۴ گرام) تک بڑھ گیا، تو نصاب یوں ہوگیا۔

(۲۰۰ × ۲،۹۵۴ = ۵۹۰،۸ گرام)

پھر اسی درہم کے مطابق دونوں دورِ حکومتوں یعنی اُموی دورِ حکومت اور عباسی دورِ حکومت میں عمل جاری رہا اور ائمہ اربعہ نے بھی اس سے اتفاق کرلیا اور اس کا وزن شرعی درہم کا وزن آج تک تک برقرار چلا جارہا ہے۔

طلوعِ اسلام

ایک ماہنامہ ہی نہیں، ایک زندہ اور زندگی بخش تحریک ہے

جس کا مقصد فکرِ قرآنی کو اس طرح عام کرنا ہے کہ وہ نوجوان طبقہ کے دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے اور وہاں سے صحیح آسمانی انقلاب بن کر اُبھرے۔ اس سلسلہ میں اس تحریک کے سالانہ اجتماعات بھی منعقد ہوتے ہیں جن میں مفکرِ قرآن، نہایت شگفتہ و شاداب انداز میں، حالاتِ حاضرہ پر روشنی ڈالتے اور پیش آمدہ مسائل کا تجزیہ قرآنی روشنی میں کرتے ہیں۔